فہرست

شذرات	اہل سیاست اور سیاسی استحکام	منظور الحسن	۲
قرآنیات	البقرہ (۲: ۱۹۷-۲۰۳)	جاوید احمد غامدی	۷
معارفِ نبوی	مشرکین کے بچوں کا انجام - سب سے پہلی مخلوق	طالب محسن	۱۳
دین و دانش	قانون معاشرت (۹)	جاوید احمد غامدی	۲۱
یسئلون	متفرق سوالات	جاوید احمد غامدی / منظور الحسن	۲۵
اصلاح و دعوت	متفرق مضامین	محمد اسلم نجمی، طالب محسن، وسیم اختر مفتی، ریحان احمد یوسفی، کاشف علی خان	۴۵
تبصرۂ کتب	''نئی دنیا (امریکہ) میں صاف صاف باتیں''	محمد بلال	۶۱
ادبیات	غزل	جاوید احمد غامدی	۶۹

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اہل سیاست اور سیاسی استحکام

ہم نے بعض گزشتہ شذرات میں فوج کی سیاست میں مداخلت کو قومی استحکام کے لیے ضرر رساں قرار دیا تھا اور اہل سیاست کی اصلاح کو سیاسی عمل کے تسلسل سے مشروط کیا تھا۔ ہم نے اس بات پر اصرار کیا تھا کہ سیاست دانوں اور سیاسی اداروں میں مثبت تبدیلی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ سیاسی عمل کو اس کی فطری رفتار کے ساتھ جاری رہنے دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں اگر بدعنوان لوگ بھی منصب اقتدار تک پہنچتے ہیں، تب بھی اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔

ہماری اس بات سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم سیاست دانوں کو ملک کے سیاسی خلفشار سے بری الذمہ سمجھتے ہیں۔ ہمارا مقدمہ صرف یہ ہے کہ سیاسی عمل کا تسلسل ہی سیاسی نظام کو آلودگیوں سے پاک کرنے کا باعث بنتا ہے۔ بہر حال، ہمارے نزدیک پاکستان میں جمہوری اقتدار کو غیر مستحکم کرنے کا الزام جس قدر فوج اور بیوروکریسی پر عائد کیا جاتا ہے، اسی قدر اس کے مستحق اہل سیاست بھی ہیں۔ جتنی یہ بات درست ہے کہ اگر فوج اور بیوروکریسی کے ادارے اپنے دائرۂ کار تک محدود رہتے تو ملک سیاسی خلفشار سے محفوظ رہتا، اتنی ہی یہ بات بھی صحیح ہے کہ اگر سیاست دان اپنے فرائض بخوبی انجام دیتے تو سیاسی استحکام کی منزل زیادہ مشکل نہ ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سیاست دانوں نے نہ صرف یہ کہ اپنے فرائض سے غفلت برتی ہے، بلکہ مجرمانہ افعال کا ارتکاب کیا ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں میں انھوں نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے بعد عوام کی لغت میں دھوکا اور سیاست ہم معنی الفاظ کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ لوگوں کے لیے اب اس کا تصور ہی محال ہے کہ کوئی سیاست دان ہوس اقتدار سے بالاتر ہو کر ان کی ترقی کے لیے سرگرم ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے اس جمہوریت پسند دور میں بھی بعض سادہ لوح لوگوں کی زبان پر یہ بات آجاتی ہے کہ ان جیسے سیاست دانوں کے اقتدار سے تو فوجی حکومت ہی بہتر ہے۔

ان دنوں جبکہ ان اہل سیاست کی اکثریت اقتدار سے محروم ہے اور انتخابات کی آمد نے انھیں عوام سے رجوع پر آمادہ کر رکھا ہے، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ان غلطیوں کے بارے میں متوجہ کیا جائے جو ان کے طرز عمل میں نمایاں طور پر پائی

جاتی ہیں اور جن کی وجہ سے عوام ان سے مایوس ہو چکے ہیں۔

ان کے طرز عمل کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے حصول اقتدار کی جدوجہد کرتے ہوئے دین واخلاق، اصول و قانون اور جمہوری اقدار کی کبھی پروا نہیں کی۔ مناصب کے حصول کے لیے اگر انھیں جھوٹ بولنا پڑا ہے تو انھوں نے بولا ہے، خوشامد کرنی پڑی ہے تو کی ہے، رشوت دینی پڑی ہے تو دی ہے، وقار کو داؤ پر لگانا پڑا ہے تو لگایا ہے، یہاں تک کہ اقتدار کے قیام ودوام کے لیے اگر انھیں آمروں کے ہاتھ بھی مضبوط کرنے پڑے ہیں تو انھوں نے اس سے بھی دریغ نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سیاسی میدان میں یہ لوگ فوج اور بیوروکریسی کے اشاروں پر حرکت کرنے والے کھلونوں سے زیادہ کوئی حیثیت کبھی اختیار نہیں کر سکے۔ ہماری سیاسی تاریخ کا یہ کوئی معمولی المیہ نہیں ہے کہ جب بھی کوئی غیر جمہوری اور غیر آئینی حکمران مسند اقتدار پر فائز ہوا ہے، ان اہل سیاست کی معتد بہ تعداد نے اپنی خدمات اسے پیش کر دی ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر کسی کی طرف سے کوئی مزاحمت بھی سامنے آئی ہے تو کسی اصول اور آدرش کی بنا پر نہیں، بلکہ محض مفادات اور تعصّبات ہی کی بنا پر سامنے آئی ہے۔

قائداعظم نے گورنر جنرل بننے کے بعد مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے کر جمہوری روایت کی بنا ڈالی، مگر لیاقت علی خان نے اسے توڑ کر جب وزارت عظمیٰ کے ساتھ مسلم لیگ کی صدارت بھی حاصل کرنا چاہی تو مسلم لیگی سیاست دانوں نے اسے خوش دلی سے قبول کیا۔ گورنر جنرل غلام محمد نے پارلیمانی روایات کے علی الرغم پارلیمنٹ کی اکثریتی جماعت کے سربراہ خواجہ ناظم الدین کو برطرف کیا تو اہل سیاست خاموش رہے۔ اس کے بعد گورنر جنرل نے یکے بعد دیگرے محمد علی بوگرا اور چودھری محمد علی جیسے غیر سیاسی افراد کو وزیر اعظم نامزد کیا تو مسلم لیگ کے اہل سیاست نے اس پر احتجاج کے بجائے انھیں اپنی جماعت کی صدارت بھی پیش کر دی۔ پھر گورنر جنرل نے منتخب دستور ساز اسمبلی توڑی تو اسے بھی کچھ احتجاج کے بعد قبول کر لیا گیا۔ بعد ازاں جب گورنر جنرل سکندر مرزا کے ایما پر مسلم لیگ کے مقابلے کے لیے ری پبلکن پارٹی تشکیل دی گئی جو نہ عوامی حمایت رکھتی تھی اور نہ مسلم لیگ کا مقابلہ کرنے کی اہل تھی تو مسلم لیگ کے بیشتر منتخب نمائندے اپنی جماعت چھوڑ کر اس میں شامل ہو گئے۔ اسی طرح جنرل ایوب خان، جنرل ضیاالحق اور جنرل پرویز مشرف نے جب غیر آئینی اور غیر جمہوری طریقے سے حکومت پر قبضہ کیا تو انھیں بھی سیاست دانوں کے طائفے سے بے شمار لوگ میسر آ گئے۔ تاریخ کے اس جائزے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہمارے اہل سیاست نے محض اپنے اقتدار کے لیے ملک میں سیاسی استحکام کو داؤ پر لگائے رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر سیاست دان ہوس اقتدار سے بالاتر رہتے اور باہم متحد ہو کر غیر جمہوری حکمرانوں کے خلاف جدوجہد جاری رکھتے تو یہ ملک اس وقت مستحکم سیاسی اقدار کا حامل ہوتا۔

اہل سیاست کی دوسری غلطی یہ ہے کہ انھوں نے عوام کے ساتھ سراسر غیر سیاسی طرز عمل اختیار کیا۔ انھوں نے نہ عوام کے اندر اپنی جڑیں مضبوط کرنے کی طرف کبھی توجہ دی، نہ ان سے رابطے کا کوئی چینل قائم کیا اور نہ ان کی تنظیم سازی کی طرف

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مائل ہوئے۔ انھوں نے عوام سے اگر کچھ ربط و تعلق قائم بھی کیا تو اسے بھی انتخابی جلسے جلوسوں تک محدود رکھا۔ عوام سے مینڈیٹ لینے کے بجائے اکثر ان کی یہی کوشش رہی کہ کسی شارٹ کٹ کے ذریعے سے ایوان اقتدار میں پہنچا جائے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ہمیشہ عوام کی ترجیحات اور امنگوں کے برعکس معاملہ کیا۔

جب کبھی برسر اقتدار آئے تو عوام سے اپنا تعلق یکسر ختم کر لیا۔ یہ تجربہ ہر شخص نے کیا کہ جو سیاسی لیڈر انتخابات کے دنوں میں اس کے ساتھ محبت سے ملتے تھے، اس کے دکھ درد کو سنتے تھے اور اس کی حاجت روائی کے وعدے کرتے تھے، انھوں نے کامیاب ہوتے ہی اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ان سیاست دانوں نے اقتدار میں آ کر اگر کچھ پروا کی تو صرف اقربا، احباب اور قریبی کارکنان کی۔ ترقی کے دروازے اگر کھولے گئے تو صرف قریبی لوگوں کے لیے اور اس ضمن میں میرٹ کا کوئی لحاظ نہ کیا گیا۔

جو سیاسی جماعتیں تشکیل دیں، انھوں نے اپنے کارکنوں میں سیاسی شعور بیدار کرنے کے بجائے ارادت کے جذبات کو پروان چڑھایا۔ انھیں اس بات کی ترغیب دی کہ قائد ہی کی بات حرف آخر ہے۔ آج اگر وہ کسی بات کو غلط کہتا ہے تو وہ سراسر باطل ہے اور کل اسی بات کو صحیح کہتا ہے تو وہ عین حق ہے۔ جماعت کے اندر اسی شخص کو ترقی کے مواقع فراہم کیے جو قائد کے اشارے پر بے بہا مال و زر لٹانے کے لیے تیار ہو یا اس کی مدح سرائی میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والا ہو۔

ملکی سطح پر تو جمہوریت کے نعرے خوب بلند کیے، مگر اپنی جماعتوں کے اندر بدترین آمریت کا مظاہرہ کیا۔ نہ کارکنوں کو اپنے قائدین منتخب کرنے کا موقع فراہم کیا، نہ نیچے سے اوپر تک مشاورت کا کوئی نظام وضع کیا اور نہ آزادیِ رائے کی گنجایش باقی رکھی۔ عوام کو جب بھی سڑکوں پر نکالا تو اس مقصد کے لیے نکالا کہ وہ اپنی جانوں، اپنی املاک اور اپنے وقت کی قربانی دے کر ان کے اقتدار کی راہیں ہموار کریں۔

عوام کے ساتھ اس طرز عمل کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ وہ ان سے پوری طرح مایوس ہو گئے۔ ان اہل سیاست پر نہ انھیں اعتماد رہا اور نہ کوئی تعلق خاطر وہ باقی رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ہم انتخابات کے موقع پر ان سیاست دانوں کے لیے عوام کی حمایت کا تجزیہ کریں تو اس کی حقیقت صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی دانست میں بڑی برائی کے مقابلے میں چھوٹی برائی کو ترجیح دے رہے ہوتے ہیں۔

ان اہل سیاست کی تیسری بڑی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے ان جمہوری اقدار کو بھی پامال کر ڈالا جو ان کی اپنی بقا کے لیے ضروری تھیں۔ وہ وعدے جن کی بنا پر انھوں نے عوام سے ووٹ لیے، برسر اقتدار آ کر ان پر عمل تو کجا، کسی کو یاد بھی نہیں رہے۔ وہ جماعتیں جن کی حمایت سے وہ ایوان حکومت میں پہنچے، ان سے اپنی وفاداری تبدیل کر لینے میں انھیں کبھی تردد نہ ہوا۔ وہ آئین اور قوانین جنھیں انھوں نے خود تخلیق کیا اور جن کی حفاظت پر وہ مامور ہوئے، ان کی خلاف ورزی کو سیاسی عمل کی ضرورت سمجھا۔ پارلیمنٹ میں اختلاف برائے اختلاف ہی کی روایت قائم کی۔ اگر حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھے

تو حکومت کے صحیح اقدامات کی بھی مخالفت کی اور اگر مسند حکومت پر فائز ہوئے تو حزب اختلاف کے وجود ہی کو برداشت کرنے سے انکار کر دیا۔قوم کی معاشی بدحالی کے باوجود ایسی مراعات کو اپنے لیے مختص کیا جو دنیا کی بڑی ریاستوں کے اربابِ اقتدار کو بھی حاصل نہیں ہیں۔قومی خزانے میں مالی بدعنوانی کی ایسی داستانیں رقم کیں جنھیں سن کر راہزن بھی کانوں کا ہاتھ لگائیں۔اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلا کہ سیاسی جماعتیں ہوں یا مقنّنہ اور انتظامیہ کے جمہوری ادارے، سب تباہ و برباد ہو کر رہ گئے۔

یہ اس طرز عمل کی ایک جھلک ہے جو ہمارے سیاست دانوں نے گزشتہ پچاس برسوں میں پیش کیا ہے۔یہ تصویر سامنے لانے سے ہمارا مقصود یہ ہرگز نہیں ہے کہ لوگ ان کے بجائے کسی اور طرف رجوع کریں، بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ اہل سیاست اس آئینے کو اپنے سامنے رکھیں اور قومی تعمیر کے لیے اپنے کردار کو نئے سرے سے ترتیب دیں۔اس موقع پر ان پر یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ ان کی اور اس ملک کی ترقی و بقا کا سفر اس وقت تک شروع نہیں ہو سکتا، جب تک وہ ایک بنیادی فیصلہ نہیں کر لیتے۔ایک ایسا فیصلہ جس سے ملک میں سیاسی استحکام کا آغاز ہو سکتا اور ان کا وقار بحال ہو سکتا ہے۔ایک ایسا فیصلہ جو رائے عامہ کا آئینہ دار اور جمہوری معاشرے کے قیام کا ضامن ہے۔یہ فیصلہ اگر نہ کیا گیا تو آگے کی طرف اٹھایا جانے والا ہر قدم ہمیں کئی قدم پیچھے لے جاتا رہے گا۔فیصلہ یہ ہے کہ اب اہل سیاست کسی غیر آئینی اور غیر جمہوری شخصیت کو نہ حکمرانی کے لیے آواز دیں گے، نہ اس کی حکومت کا ساتھ دیں گے اور نہ اس کے جبر کے خلاف خاموش رہیں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

منظور الحسن

"بعض لوگ اپنے دین داری کے کاموں کو بڑی اہمیت دے بیٹھتے ہیں اور اپنے زعم میں وہ اللہ اور رسول کے محسن بن جاتے ہیں۔اس طرح کے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی جو اپنے رب کے حضور میں کوئی پیش کرتا ہے، کیا اس کی اپنی ہوتی ہے؟ اگر اس نے اپنا سارا مال خدا کی راہ میں لٹا دیا تو یہ مال خدا ہی کا دیا ہوا تھا۔اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ اس نے اپنی صلاحیت و قابلیت سے حاصل کیا تھا تو اسے یہ بھولنا نہ چاہیے کہ یہ قابلیت اور صلاحیت بھی کوئی اپنے گھر سے نہیں لایا، بلکہ یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی بخشتا ہے۔مال تو درکنار اگر کوئی شخص اپنی جان بھی، جس سے بڑی انسان کے پاس کوئی چیز نہیں ہے، اللہ کی راہ میں قربان کر دے تو اس پر بھی فخر کے بجائے اعتراف تقصیر ہی کرنا چاہیے۔" (تزکیۂ نفس، مولانا امین احسن اصلاحی ۲/۹۲)

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورة البقرة

(۴۱)

گزشتہ سے پیوستہ

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ، فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ، وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ، وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ

حج کے[۵۳۸] متعین مہینے ہیں۔[۵۳۹] سو اِن میں جو شخص بھی (احرام باندھ کر) حج کا ارادہ کر لے،[۵۴۰] اُسے پھر حج کے اِس زمانے میں نہ کوئی شہوت کی بات کرنی ہے، نہ خدا کی نافرمانی کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی کوئی بات اُس سے سرزد ہونی چاہیے۔[۵۴۱] اور (یاد رہے کہ) جو نیکی بھی تم کرو گے، اللہ اُسے جانتا ہے۔ اور (حج کے اِس سفر میں تقویٰ

[۵۳۸] موقع دلیل ہے کہ حج کا لفظ یہاں علیٰ سبیل التغلیب حج اکبر اور حج اصغر، یعنی حج و عمرہ، دونوں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

[۵۳۹] یعنی یہ کچھ ایسی لامحدود اور غیر متعین مدت نہیں ہے کہ اس کی پابندیوں سے لوگ ہراساں ہوں۔ زیادہ سے زیادہ چند مہینوں کی بات ہے۔ بندۂ مومن کو حوصلے کے ساتھ اور خدا سے ڈرتے ہوئے یہ مدت پوری احتیاط کے ساتھ گزارنی چاہیے۔

[۵۴۰] اصل میں 'فمن فرض فیھن الحج' کے الفاظ آئے ہیں۔ ان میں 'فرض فیھن' کا اسلوب دلیل ہے کہ اس سے مراد وہی وقت ہے، جب آدمی احرام باندھ کر حج کا پختہ عزم کر لیتا ہے۔

[۵۴۱] یہاں جن تین چیزوں سے منع کیا گیا ہے، ان کی ممانعت کے وجوہ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر

الزَّادِ التَّقْوٰی، وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ ـ ﴿۱۹۷﴾
لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ۔ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ
عَرَفٰتٍ فَاذْکُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ، وَاذْکُرُوْهُ کَمَا هَدٰکُمْ وَاِنْ

کا) زادراہ لے کر نکلو، اِس لیے کہ بہترین زادراہ یہی تقویٰ کا زادراہ ہے۔[۵۴۲] اور عقل والو، مجھ سے ڈرتے رہو۔ ۱۹۷
(اِس کے ساتھ، البتہ) کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرو۔[۵۴۳] لیکن (یاد رہے کہ مزدلفہ کوئی
کھیل تماشے اور تجارت کی جگہ نہیں ہے، اِس لیے) جب عرفات سے چلو تو مشعر الحرام کے پاس اللہ کو یاد کرو
اور اُسی طرح یاد کرو، جس طرح اُس نے تمھیں ہدایت فرمائی ہے۔[۵۴۴] اور اِس سے پہلے تو بلاشبہ تم لوگ گم راہوں

میں اس طرح واضح فرمائے ہیں:

> ''ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلام میں یہ عبادت انسان کو ترک دنیا اور زہد کی اس آخری حد سے آشنا کرنے والی ہے جس سے آشنا ہونا اسلام میں مطلوب و مرغوب ہے اور جو تربیت و تزکیہ کے لیے ضروری ہے۔ اس سے آگے رہبانیت کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں جن میں داخل ہونے سے اسلام نے روکا ہے۔
>
> دوسری وجہ یہ ہے کہ احرام کی پابندیوں کی وجہ سے ان چیزوں کے لیے نفس کے اندر اکساہٹ بہت بڑھ جاتی ہے۔ انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ جس چیز سے وہ روک دیا جائے، اس کی خواہش اس کے اندر دوچند ہو جاتی ہے اور شیطان اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔
>
> تیسری وجہ یہ ہے کہ سفر کی حالت ہونے کے سبب سے ان چیزوں کے مواقع بہت پیش آتے ہیں۔ آدمی اگر چوکنا نہ رہے تو ہر قدم پر فتنہ میں پڑ سکتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۸۵)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

[۵۴۲] اصل الفاظ ہیں: 'تزودوا فان خیر الزاد التقوىٰ'۔ عربیت کی اداشناس جانتے ہیں کہ 'فان' کا لفظ جب اس طرح آتا ہے تو اپنے ماقبل کی توجیہ و تعلیل کے لیے آتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو ضروری ہے کہ 'تزودوا' کے بعد 'التقویٰ' کا لفظ اس جملے میں حذف مانا جائے۔ اس کی کوئی دوسری تالیف یہاں کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتی۔

[۵۴۳] اس سے مراد معاشی فوائد ہیں۔ 'فضلاً من ربکم' کی تعبیر قرآن میں بالعموم اسی مفہوم کے لیے آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حج کے سفر سے اصل مقصود تو حج ہی ہونا چاہیے، لیکن اس میں کوئی مضایقہ نہیں کہ اس کے ساتھ کوئی شخص اس سفر سے اپنے لیے کچھ معاشی فوائد بھی حاصل کر لے۔

[۵۴۴] یہ اس لیے فرمایا ہے کہ جاہلیت میں لوگ مزدلفہ پہنچتے تو وہاں تسبیح و تہلیل اور ذکر و عبادت کے بجائے جگہ جگہ

كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ـ ﴿۱۹۸﴾
ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ، وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ـ ﴿۱۹۹﴾
فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ
ذِكْرًا ـ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا وَمَالَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ

میں تھے۔[۵۴۵] ۱۹۸

پھر (یہ بھی ضروری ہے کہ) جہاں سے اور سب لوگ پلٹتے ہیں، تم بھی، (اے قریش کے لوگو)، وہیں سے پلٹو[۵۴۶] اور اللہ سے مغفرت چاہو۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ ۱۹۹

(اور یہ بھی کہ) اِس کے بعد جب حج کے مناسک پورے کر لو تو جس طرح پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو، اُسی طرح اب اللہ کو یاد کرو، بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔[۵۴۷] (یہ اللہ سے مانگنے کا موقع ہے)، مگر لوگوں میں ایسے بھی ہیں کہ وہ (اِس موقع پر بھی) یہی کہتے ہیں کہ پروردگار، ہمیں دنیا میں دے دے[۵۴۸]، اور (اِس

آگ جلاتے اور قصیدہ خوانی، داستان گوئی اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد کرتے تھے۔

[۵۴۵] مطلب یہ ہے کہ حج و عمرہ کے بارے میں اس رہنمائی کی قدر کرو جو قرآن کے ذریعے سے تمھیں دی جا رہی ہے۔ اس سے پہلے تو اللہ کے مقرر کردہ ان شعائر کو تم نے کھیل تماشے کی جگہ بنا رکھا تھا۔ یہ خدا کی عنایت ہے کہ علم و معرفت کی ان جلوہ گاہوں کی حقیقت اس نے تم پر واضح کر دی ہے۔

[۵۴۶] اس ہدایت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ زمانۂ جاہلیت میں قریش نے یہ امتیاز قائم کر لیا تھا کہ عرفات کی حاضری وہ اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے تھے اور مزدلفہ تک جا کر ہی پلٹ آتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ بیت اللہ کے پروہت اور مجاور ہیں، اس وجہ سے ان کے لیے حدود حرم سے باہر نکلنا مناسب نہیں ہے۔

[۵۴۷] یعنی قیام منیٰ کے ایام میں اپنے باپ دادا کے لیے مفاخرت کی جو مجلسیں تم منعقد کرتے رہے ہو، ان کی جگہ اور ان سے زیادہ اہتمام اور جوش و خروش کے ساتھ تمھیں اب اپنے پروردگار کی یاد میں مشغول ہونا چاہیے۔

[۵۴۸] حج و عمرہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ عہد غلامی کی تجدید اور ابلیس کے خلاف انسان کی ابدی جنگ کا نہایت روح پرور علامتی اظہار ہیں، لیکن انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ ایسی عظیم عبادات کو بھی بالعموم اپنے دنیوی مفادات کے حوالے ہی سے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خَلَاق، ﴿۲۰۰﴾ وَ مِنۡهُمۡ مَّنۡ یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَّ فِی الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ نَصِیۡبٌ مِّمَّا کَسَبُوۡا، وَاللّٰهُ سَرِیۡعُ الۡحِسَابِ۔ ﴿۲۰۲﴾

کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر) آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں رہتا۔ اور ایسے بھی ہیں کہ جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ پروردگار، ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے[۵۴۹]۔ یہی ہیں جو اپنی کمائی کا حصہ پا لیں گے، اور اللہ کو حساب چکاتے کبھی دیر نہیں لگتی[۵۵۰]۔ ۲۰۰-۲۰۲

دیکھتا ہے۔

[۵۴۹] اس سے معلوم ہوا کہ دعا کا یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''اس دعا سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ بندے کو اپنے رب سے دنیا اور آخرت، دونوں کی بھلائی طلب کرنی چاہیے اور اس بھلائی کا فیصلہ اور انتخاب اسی پر چھوڑنا چاہیے۔ وہی سب سے زیادہ بہتر طریقے پر جانتا ہے کہ ہمارے لیے حقیقی خیر کس چیز میں ہے۔ خاص طور پر دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کا خیر ہونا تو منحصر ہے اس امر پر کہ وہ چیز ہمارے لیے آخرت کی کامیابی کا وسیلہ و ذریعہ بن سکے اور کسی چیز کے اس پہلو کو جاننا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ اس وجہ سے بندے کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ اس معاملے کو اللہ تعالیٰ ہی پر چھوڑے، اپنی طرف سے کوئی تجویز پیش نہ کرے۔ البتہ، دوزخ کے عذاب سے برابر پناہ مانگتا رہے۔ یہ بڑی سخت چیز ہے۔ بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ سے پناہ میں رکھے۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۸۸)

[۵۵۰] موقع کلام دلیل ہے کہ یہاں یہ جملہ تسلی کے سیاق میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مطمئن رہو، خدا کے وعدوں کے پورے ہونے میں دیر نہیں ہو گی۔ تمھارا اجر تمھیں ملے گا تو یہی سمجھو گے کہ تمھاری مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی تمھیں مل گئی ہے۔

استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اس کی وضاحت میں لکھا ہے:

''یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ ان معاملات میں ساری اہمیت اس احساس کی ہے جو انسان کو جزا و سزا کے وقت ہو گا۔ اگر جزا و سزا کے وقت کا احساس یہی ہو گا کہ عمل اور جزا کے درمیان کا فاصلہ اب بالکل غائب ہو گیا تو پھر یہ فاصلہ بالکل ناقابل لحاظ ہے۔ پھر تو صحیح یہی ہے کہ مجرم اپنی سزا کو سامنے رکھے اور مومن اپنی جزا کو۔ نہ وہ مہلت سے مغرور ہو نہ یہ تاخیر سے بے صبر۔ اور اگر کوئی شخص اپنی نافہمی سے اس فاصلے کو اہمیت دے بھی تو اسے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ 'من مات فقد قامت قیامته' کہ جو شخص مرا، اس کی قیامت کھڑی ہو گئی۔'' (تدبر قرآن ۱/۴۸۹)

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٢٠٣﴾

اور (منیٰ کے) چند متعین دنوں[۵۵۱] میں اللہ کو یاد کرو۔ پھر جس نے جلدی کی اور دو ہی دنوں میں چل کھڑا ہوا، اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں اور جو دیر سے چلا اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں[۵۵۲]۔ (ہاں، مگر) اُن کے لیے جو اللہ سے ڈریں[۵۵۳] اور تم بھی اللہ سے ڈرتے رہو، اور خوب جان لو کہ (ایک دن) تم اُسی کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے[۵۵۴]۔ ۲۰۳

---

[۵۵۱] اصل میں 'فی ایام معدو دات' کے الفاظ ہیں۔ یعنی گنے ہوئے دن۔ یہ اسلوب جس طرح بیان تقلیل کے لیے موزوں ہے، اسی طرح اگر غور کیجیے تو تعیین وتحدید کے لیے بھی بالکل موزوں ہے۔ ہمارے نزدیک، اس آیت میں یہ اسی دوسرے مفہوم میں ہے۔

[۵۵۲] یعنی اجازت ہے کہ کوئی شخص ۱۳ ذوالحجہ تک ٹھیرے یا ۱۲ کو واپس چلا آئے۔ دونوں ہی صورتوں میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ عبادات میں جو چیز جس طرح متعین کر دی جائے، اس میں جس طرح کمی جائز نہیں ہے، اسی طرح اضافہ بھی جائز نہیں ہے۔

[۵۵۳] یعنی اصل اہمیت اس کی نہیں کہ لوگ کتنے دن ٹھیرے، بلکہ اس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے، خدا کی یاد میں اور اس سے ڈرتے ہوئے ٹھیرے۔ عبادت کی روح تقویٰ ہے۔ رسوم وآداب سے یہی مقصود ہے۔ یہ ہو تو دو دن بھی بہت ہیں اور نہ ہو تو دس دن کے قیام سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

[۵۵۴] یہ آخر میں تنبیہ ہے کہ جس طرح یہاں اکٹھے ہو، روز حشر بھی اسی طرح خدا کے حضور میں اکٹھے کیے جاؤ گے۔ یہاں سے بھاگ سکتے ہو، لیکن اس دن کسی کے لیے بھی خدا کے حکم کے بغیر اس کے سامنے سے ہٹنا ممکن نہ ہوگا۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

مشرکین کے بچوں کا انجام

(مشکوۃ المصابیح، حدیث ۹۴۔۹۵)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عن أبی هریرة رضی اللّٰہ عنہ: سئل رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عن ذراری المسلمین۔ قال: اللّٰہ أعلم بما کانوا عاملین۔

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکین کے بچوں (کے انجام) کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سب سے بڑھ کر جانتے ہیں کہ وہ کیا کرنے والے ہوتے۔''

لغوی مباحث

ذراری: 'ذریة' کی جمع ہے۔ اس کا اطلاق انسانوں کی نسل پر ہوتا ہے۔ اسی طرح جنوں کی نسل کے لیے بھی یہی لفظ بول لیتے ہیں۔ بسا اوقات اس میں بچے ہی نہیں بڑے بھی شامل ہوتے ہیں۔ روایت میں اس سے چھوٹی عمر کے معصوم بچے ہی مراد ہیں۔ ایک بحث اس کے مادے سے متعلق بھی ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس کا مادہ 'ذ ر ر' ہے۔ اس کے معنی پھیلانے کے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس کا مادہ 'ذ ر ء' ہے۔ اور ہمزہ حذف ہو گیا ہے یا بدل دیا گیا ہے۔ اس مادے کے اعتبار سے اس کے معنی خلق کے ہیں۔

بما کانوا عاملین: یہاں 'کان' ''تھا'' کے معنی میں نہیں ہے اور اس کا مفہوم ہم نے ترجمے سے واضح کر دیا ہے۔

متون

کتب حدیث میں متعدد روایات اس مضمون کی حامل ہیں، لیکن یہ سوال اور اس کا یہ جواب ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما نے روایت کیا ہے۔ اس روایت کے سارے متون میں کم وبیش یہی الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ صرف ایک روایت میں 'سئل عن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و سلم' کی جگہ 'سئل عن النبی صلی اللّٰہ علیہ و سلم' کے الفاظ آئے ہیں۔ اسی طرح ایک دوسری روایت میں مشرکین کے بجائے کفار کا لفظ آیا ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی فرق نہیں ہے۔ ان روایات میں سائل کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ہے اور نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال کسی خاص پس منظر میں پوچھا گیا تھا یا نہیں۔ بچوں کے انجام کے بارے میں ایک روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ اس روایت میں حضرت عائشہ نے مشرکین اور مومنین، دونوں کے بچوں کے بارے میں سوال کیا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عن عائشة رضی اللّٰہ عنها قالت : قلت یا رسول اللّٰہ ذراری المؤمنین ؟ فقال : هم من آبائهم . فقلت : یا رسول اللّٰہ ، بلا عمل ؟ قال : اللّٰہ اعلم بما کانوا عاملین . قلت یا رسول اللّٰہ ، فذراری المشرکین . قال : من آبائهم . قلت : بلا عمل ؟ قال : اللّٰہ اعلم بما کانوا عاملین ۔ (ابوداؤد، رقم ۴۰۷۹)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوچھا: یارسول اللہ، اہل ایمان کے بچوں (کا معاملہ کیا ہوگا)؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا: وہ اپنے آبا میں سے ہیں۔ اس پر میں نے پوچھا: یارسول اللہ کیا بغیر عمل کے؟ آپ نے فرمایا: اللہ سب سے زیادہ جانتا ہے جو کچھ وہ کرنے والے ہوتے۔ میں نے پوچھا: یارسول اللہ، تو مشرکین کے بچے؟ آپ نے فرمایا: وہ اپنے آبا میں سے ہیں۔ میں نے کہا: بغیر کسی عمل کے؟ آپ نے فرمایا: اللہ زیادہ جانتا ہے کہ وہ کیا کرنے والے بنتے۔''

ظاہر ہے یہ روایت اور زیر بحث روایت مضمون کے اشتراک کے باوجود الگ الگ روایتیں ہیں۔ اس مضمون کی تمام روایات کو جمع کریں تو بچوں کے انجام کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تین جوابات سامنے آتے ہیں:

ایک یہ کہ بچے فطرت پر ہوتے ہیں۔ جب تک وہ بڑے ہو کر اپنے والدین کے زیر اثر کوئی عقیدہ وعمل اختیار نہ کر لیں۔

دوسرے یہ کہ کفار کے بچوں کا انجام ان کے والدین کے ساتھ ہوگا اور اہل ایمان کے بچوں کا انجام اہل ایمان کے ساتھ اور اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کا ان کے مستقبل کے بارے میں علم ہے۔

تیسرے یہ کہ بچے جنتیوں کے خدام ہوں گے۔ پہلے اور تیسرے جواب میں ایک اعتبار سے مطابقت ہے۔ یعنی عمل کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

عدم موجودگی کے باعث انعام یا سزا کا کوئی سبب نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ انھیں اہل جنت کا خادم بنا دیں گے۔

معنی

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اللہ تعالیٰ اپنے علم کی روشنی میں بچے کا انجام طے کریں گے۔ روایت کا یہ مفہوم قرآن مجید کے تصور عدل کے منافی ہے۔ یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا وہ صحیح صورت میں روایت نہیں ہو سکا۔ دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اسے اس معاملے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے توقف پر محمول کیا جائے۔ اگرچہ یہ بات روایت کے الفاظ سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتی، لیکن اس صورت میں روایت اعتراض سے قدرے محفوظ ہو جاتی ہے۔

ہم نے بچوں کے انجام کے حوالے سے تفصیلی بحث اس سے پہلے حدیث ۸۴ کے تحت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل کامل ہیں۔ وہاں کسی کے ساتھ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ بچے جہنم میں ڈال دیے جائیں جو کسی برائی کے مرتکب نہیں ہوئے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کتابیات

بخاری، کتاب الجنائز، رقم ۱۲۹۵۔ بخاری، کتاب القدر، رقم ۶۱۰۹۔ نسائی، کتاب الجنائز، رقم ۱۹۲۶۔ ابوداؤد، کتاب السنہ، رقم ۴۰۷۹۔ احمد، رقم ۷۱۴۴، ۲۹۹۹، ۷۴۹۷، ۸۲۰۶، ۱۹۷۷۶، ۲۴۵۶۱، ۲۳۴۰۶۔ مسند ابی عوانہ، رقم ۶۵۸۸ تا ۶۵۹۱۔ مجمع الزوائد، ۷/ ۲۱۹۔ سنن البیہقی، رقم ۱۷۸۷۰۔ مسند ابو یعلیٰ، رقم ۲۴۷۹۔ صحیح ابن حبان، رقم ۱۳۱۔

سب سے پہلی مخلوق

عن عبادة بن الصامت رضى اللّٰه عنه قال : قال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه و سلم إن أول ما خلق اللّٰه القلم ۔ فقال له : اكتب ۔ فقال : ما أكتب؟ قال : اكتب القدر۔ فكتب ما كان و ما هو كائن الى الابد ۔

''عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سب سے پہلی چیز جسے اللہ تعالیٰ نے تخلیق کیا قلم ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا: لکھو۔ اس نے پوچھا: کیا لکھوں؟

اللہ تعالیٰ نے کہا: تقدیر لکھو۔ چنانچہ اس نے وہ تمام چیزیں لکھ دیں جو ہو چکیں اور جو ابد تک ہونے والی ہیں۔‘‘

لغوی مباحث

القدر: لفظی معنی اندازہ کرنے اور ٹھیرانے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اس سے تقدیر مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے لیے جو کچھ طے کر رکھا ہے۔

الابد: یہ لفظ زمانہ، طویل زمانہ یا مدت، لمبی عمر اور زمانۂ آخر کے معنی میں آتا ہے۔ اس روایت میں یہ آخری معنی میں آیا ہے۔

متون

یہ روایت صاحب مشکوٰۃ نے ترمذی سے لی ہے، لیکن روایت کا وہی حصہ نقل کیا ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول نقل ہوا ہے۔ ترمذی نے روایت کے نقل ہونے کا پس منظر بھی درج کیا ہے۔ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ پس منظر بھی درج کر دیا جائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری کے فکری رجحانات کیا تھے:

حدثنا عبد الواحد بن سليم، قال قدمت مكة . فلقيت عطاء بن أبي رباح . فقلت له : يا أبا محمد ، إن أهل البصرة يقولون في القدر . قال : يابني ، أتقرأ القرآن . قلت : نعم . قال: فاقرأ الزخرف . قال : فقرأت : حم والكتاب المبين إنا جعلناه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون وإنه في أم الكتاب لدينا لعلي حكيم . فقال : أتدري ما أم الكتاب ؟ قلت ا للّٰه و رسوله أعلم . قال : فإنه كتاب. كتب ا للّٰه قبل أن يخلق السموات و قبل أن يخلق

’’عبدالواحد بن سلیم بیان کرتے ہیں کہ میں مکہ آیا اور میں نے عطا بن ابی رباح سے ملاقات کی اور ان سے کہا: ابو محمد، اہل بصرہ تقدیر کے باب میں بحث کر رہے ہیں۔ (یعنی اس کا انکار کر رہے ہیں)۔ انھوں نے کہا: میرے بیٹے، کیا تم قرآن پڑھتے ہو؟ میں نے کہا: جی ہاں۔ انھوں نے کہا سورۂ زخرف پڑھو۔ میں نے سورۂ زخرف پڑھنا شروع کی: حم والكتاب المبين إنا جعلناه قرآنا عربيا و إنه في أم الكتاب لدينا لعلي حكيم . (۴۳: ۱۔۴) یہاں روک کر انھوں نے پوچھا: کیا تم جانتے ہو یہ ام الکتاب کیا ہے؟ میں نے کہا: اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ انھوں نے وضاحت کی یہ ایک کتاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے اس سے پہلے کہ وہ

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

الأرض. فيه إن فرعون من أهل النار. وفيه تبت يدا أبي لهب و تب. قال عطاء: فلقيت الوليد بن عبادة بن الصامت صاحب رسول الله صلى الله عليه وسلم فسألته: ما كان وصيت أبيك عند الموت. قال: دعاني أبي. فقال لي يا بني: اتق الله واعلم أنك لا تتقي الله حتى تؤمن بالقدر كله خيره و شره. فإن مت على غير هذا دخلت النار. إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: إن أول .... ۔ (ترمذی، رقم ۲۰۸۱)

آسمان تخلیق کرے اور اس سے پہلے کہ وہ زمین پیدا کرے لکھا تھا۔ اس میں ہے کہ فرعون آگ والوں میں سے ہے۔ اور اس میں 'تبت یدا أبی لهب و تب' بھی لکھا ہوا ہے۔ (اس کے بعد) عطا نے بتایا کہ میں عبادہ بن صامت کے بیٹے ولید سے بھی ملا تھا۔ عبادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں اور میں نے ولید سے پوچھا تھا: تمھارے والد کی موت کے موقع پر تمھارے لیے کیا وصیت تھی۔ ولید نے بتایا: میرے والد نے مجھے بلایا: انھوں نے مجھ سے کہا اے میرے بیٹے، خدا سے ڈرو اور جان رکھو کہ تم خدا سے اس وقت تک (حقیقی معنی میں) نہیں ڈرو گے جب تک تقدیر کے خیر و شر پر ایمان نہیں لے آؤ گے۔ اگر تمھاری موت اس کے علاوہ کسی چیز پر ہوئی تو جہنم میں جاؤ گے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ سب سے پہلی چیز........''

ترمذی نے اس روایت کا ایک اور متن کتاب التفسیر میں بھی نقل کیا ہے۔ اس میں یہ پس منظر کافی مختصر ہے اور روایت کے آخری حصے میں قلم کا 'ما أکتب؟' والا سوال بھی نہیں ہے اور آخر میں 'فکتب ما کان و ما هو کائن الی الابد' کے بجائے 'فجری بما هو کائن إلی الأبد' کے الفاظ نقل ہوئے ہیں۔ ابوداؤد نے بھی زیر بحث روایت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی وصیت کے حصے کی حیثیت ہی سے نقل کی ہے۔ اس میں وصیت کے الفاظ اس طرح سے ہیں:

عن أبي حفصة قال: قال عبادة بن الصامت لابنه: يا بني، إنك لن تجد طعم حقيقة الإيمان حتى تعلم أن ما أصابك لم يكن ليخطئك و ما أخطأك لم يكن ليصيبك. سمعت رسول الله

''ابوحفصہ سے مروی ہے کہ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو (وصیت کرتے ہوئے) کہا تھا: اے میرے بیٹے تم ایمان کی حقیقت کے ذائقے کو نہیں پا سکتے جب تک یہ نہ جان لو کہ جو (خیر و شر) تمھیں پہنچا ہے، ممکن نہیں تھا کہ تم سے چوک جاتا۔ اور جو کچھ چوک گیا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

صلى الله عليه و سلم يقول ......

(ابوداؤد، رقم ۴۷۰۴)

ہے، ناممکن تھا کہ تم تک پہنچے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے ....‘‘

مستدرک میں حضرت ابن عباس کا ایک اثر نقل ہوا ہے۔ اس کے مطابق یہ قلم نور سے بنایا گیا تھا۔ اثر کے الفاظ ہیں:

عن ابن عباس رضى الله عنه قال : أول ما خلق الله القلم . خلقه من هجا قبل الألف و اللام . فتصور قلما من نور . فقيل له : أجر فى اللوح المحفوظ . قال : يا رب ، بماذا ؟ قال : بما يكون إلى يوم القيامة ......

(المستدرک، رقم ۳۶۹۳)

’’حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بیان کرتے ہیں کہ سب سے پہلی چیز جسے تخلیق کیا گیا قلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے الف لام سے پہلے حروف تہجی سے تخلیق کیا۔ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے نور سے ایک قلم کا نقشہ بنایا۔ پھر اس سے کہا گیا: لوح محفوظ میں جاری ہو جا۔ اس نے پوچھا: میرے پروردگار کس چیز کے ساتھ؟ فرمایا: جو کچھ قیامت تک ہونے والا ہے........‘‘

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

معنی

ہم یہ بات اس سے پہلی روایات سے جان چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابد الآباد تک جو کچھ ہونے والا ہے، وہ زمین و آسمان کی تخلیق سے پچاس ہزار سال پہلے لکھ دیا تھا۔ خیال ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سے یہ بھی مستنبط کیا کہ ان امور کے لکھنے کے لیے قلم تخلیق کیا گیا ہوگا۔

قرآن مجید میں اس ضمن میں کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے سب سے پہلی مخلوق کا تعین کیا جا سکے۔ شارحین کو اس روایت کے لفظ ’اول‘ کی توجیہہ کرنے میں مشکل پیش آئی ہے، کیونکہ عرش، پانی، لوح محفوظ اور نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ وہ سب سے پہلے تخلیق کیے گئے۔ قرآن مجید کی آیت ’كان عرشه على الماء‘ کی وضاحت ہم حدیث ۹۲ کے تحت کر چکے ہیں اور خود قرآن مجید ہی سے واضح ہے کہ اس کا محل بالکل مختلف ہے۔ نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم والی روایت محدثین کے نزدیک لائق اعتنا نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ لوح و قلم کے لفظ صرف اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ابد تک کے امور کا ریکارڈ تیار کر رکھا ہے۔ آج انسان اس کی متعدد صورتیں ایجاد کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا ہوگا، کوئی بات کہنا محض حدود سے تجاوز ہوگا۔

بنیادی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم محیط کل ہے۔ اس نے ابد تک کے امور کو ان کے وقوع سے بہت پہلے جان لیا تھا۔ باقی رہا تخلیق کا عمل تو اس کے معاملے میں ہمیں محض چند چیزیں بتائی گئی ہیں۔ ان کے جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں

ہے۔لہٰذا اس باب میں توقف ہی بہتر ہے۔

مجھے بعض شارحین کی یہ بات درست لگتی ہے کہ اول کا لفظ خاص سیاق وسباق میں ہے۔اس سے قلم کو سب سے پہلی مخلوق قرار دینا موزوں نہیں،لیکن وہ جن چیزوں کو اولیت دے رہے ہیں وہ بھی محل نظر ہیں۔

کتابیات

ترمذی، کتاب القدر، رقم ۲۰۸۱۔ کتاب تفسیر القرآن، رقم ۳۲۴۱۔ابوداؤد، کتاب السنہ، رقم ۴۰۳۷۔احمد، رقم ۲۱۶۴۷، ۲۱۶۴۹۔ المستدرک، رقم ۳۶۹۳۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

قانون معاشرت

(۹)

(گزشتہ سے پیوستہ)

طلاق

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ، وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ، لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ، وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ، فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ۔ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا۔ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ، وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ، وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ۔ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ، وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا، وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ، اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ، قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔ وَالّٰٓئِيْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ، اِنِ ارْتَبْتُمْ، فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ، وَّالّٰٓئِيْ لَمْ يَحِضْنَ، وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ، وَ مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا۔ ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ، وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا۔ اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ، وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ۔ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ، وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ، وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ

أُخۡرٰی، لِیُنۡفِقۡ ذُوۡ سَعَۃٍ مِّنۡ سَعَتِہٖ، وَمَنۡ قُدِرَ عَلَیۡہِ رِزۡقُہٗ فَلۡیُنۡفِقۡ مِمَّآ اٰتٰہُ اللّٰہُ، لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا مَآ اٰتٰھَا، سَیَجۡعَلُ اللّٰہُ بَعۡدَ عُسۡرٍ یُّسۡرًا۔ (الطلاق ۶۵: ۱۔۷)

''اے نبی، تم لوگ اپنی بیویوں کو طلاق دو تو عدت کے حساب سے طلاق دو اور عدت کا یہ زمانہ ٹھیک ٹھیک شمار کرو اور اللہ، اپنے پروردگار سے ڈرتے رہو۔ (عدت کے دوران میں) نہ تم انھیں اُن کے گھروں سے نکالو، نہ وہ خود نکلیں، الاّ یہ کہ وہ کسی صریح بے حیائی کی مرتکب ہوں۔ اور (یاد رکھو کہ) یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور جو اللہ کی حدوں سے تجاوز کریں گے تو (سمجھ لو کہ) انھوں نے اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھایا۔ تم نہیں جانتے، شاید اللہ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔ (اسی طرح طلاق دو)، پھر جب وہ اپنی عدت کے خاتمے پر پہنچ جائیں تو یا اُنھیں بھلے طریقے سے نکاح میں رکھو یا بھلے طریقے سے الگ کر دو۔ اور (نباہ کا ارادہ ہو یا جدائی کا، دونوں صورتوں میں) دو ثقہ آدمیوں کو اپنے میں سے گواہ بنا لو۔ اور (گواہی دینے والو)، تم اِس گواہی کو اللہ کے لیے قائم رکھو۔ یہ بات ہے جس کی اُن لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ سے ڈریں گے، (اُنھیں کوئی مشکل پیش آئی) تو اللہ اُن کے لیے (اِس سے نکلنے کا) راستہ پیدا کرے گا اور اُنھیں وہاں سے رزق دے گا، جدھر اُن کا گمان بھی نہ جاتا ہو۔ اور جو اللہ پر بھروسا کریں گے، وہ اُن (کی دست گیری) کے لیے کافی ہے۔ اللہ اپنے ارادے پورے کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرر کر رکھی ہے۔ اور تمھاری عورتوں میں سے جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اور وہ بھی جنھیں (حیض کی عمر کو پہنچنے کے باوجود) حیض نہیں آیا، ان کے بارے میں اگر کوئی شک ہو تو اُن کی عدت تین مہینے ہو گی اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ حمل سے فارغ ہو جائیں۔ اور (تم میں سے) جو اللہ سے ڈرے گا، اللہ اُس کے لیے اُس کے معاملے میں سہولت پیدا کر دے گا۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو اُس نے تمھاری طرف نازل کیا ہے۔ اور جو اللہ سے ڈرے گا، وہ اُس کے گناہ اُس سے دور کر دے گا اور اُس کو بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ (زمانۂ عدت میں) ان عورتوں کو وہیں رکھو، جہاں تم رہتے ہو، اپنی حیثیت کے مطابق۔ اور ان پر عرصہ تنگ کرنے کے لیے انھیں ستاؤ نہیں۔ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو اُن پر اُس وقت تک خرچ کرتے رہو، جب تک وہ حمل سے فارغ نہ ہو جائیں۔ پھر اگر وہ تمھارے بچے کو دودھ پلائیں تو اُن کا معاوضہ انھیں دو اور یہ معاملہ دستور کے مطابق باہمی مشورے سے طے کر لو۔ اور اگر تم زحمت محسوس کرو تو شوہر کے لیے بچے کو کوئی دوسری عورت دودھ پلا لے گی۔ چاہیے کہ خوش حال آدمی اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے اور جسے نپا تلا ہی ملا ہے، وہ اسی میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اُسے دیا ہے۔ اللہ نے جس کو جتنا دیا ہے، اس سے زیادہ کا وہ اس پر بوجھ نہیں ڈالتا۔ (تم مطمئن رہو)، اللہ عنقریب کچھ تنگی کے بعد آسانی عطا فرمائے گا۔''

میاں بیوی میں نباہ نہ ہو سکے تو انبیا علیہم السلام کے دین میں علیحدگی کی گنجایش ہمیشہ رہی ہے۔ اصطلاح میں اسے طلاق کہا جاتا ہے۔ دین ابراہیمی کی روایات کے تحت عرب جاہلیت بھی اس سے پوری طرح واقف تھے۔ بعض بدعات اور انحرافات تو یقیناً راہ پا گئے تھے، لیکن ان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طلاق کا قانون ان کے ہاں بھی کم و بیش وہی تھا جو اب اسلام میں ہے۔[۲۶] سورۂ طلاق کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے چند ترامیم اور اضافوں کے ساتھ اسی قانون کی

تجدید فرمائی ہے۔ اس کی بعض تفصیلات بقرہ و احزاب میں بھی بیان ہوئی ہیں، لیکن غور کیجیے تو صاف واضح ہوتا ہے کہ اس میں اصل کی حیثیت سورۂ طلاق کی ان آیات ہی کو حاصل ہے۔

ہم یہاں اس قانون کی وضاحت کریں گے۔

طلاق سے پہلے

طلاق کا یہ حکم جس صورت حال سے متعلق ہے، اس کی نوبت پہنچنے سے پہلے ہر شخص کی خواہش ہونی چاہیے کہ جو رشتہ ایک مرتبہ قائم ہو گیا ہے، اسے ممکن حد تک ٹوٹنے سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ سورۂ نساء میں اللہ تعالیٰ نے اسی بنا پر شوہر کو اجازت دی ہے کہ وہ بیوی کے نشوز پر اس کی تادیب کر سکتا ہے۔ لیکن اصلاح کی تمام ممکن تدابیر اختیار کر لینے کے بعد بھی اگر صورت حال بہتر نہیں ہوتی اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اب یہ رشتہ قائم نہ رہ سکے گا تو طلاق سے پہلے آخری تدبیر کے طور پر اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے قبیلہ، برادری اور ان کے رشتہ داروں اور خیر خواہوں کو اسی سورہ میں ہدایت فرمائی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر معاملات کو سدھارنے کی کوشش کریں۔ اس کی صورت قرآن نے یہ بتائی ہے کہ ایک حکم میاں اور ایک بیوی کے خاندان میں سے منتخب کیا جائے اور وہ دونوں مل کر ان میں صلح کرائیں۔ اس سے توقع ہے کہ جس جھگڑے کو فریقین خود طے کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، وہ خاندان کے بزرگوں اور دوسرے خیر خواہوں اور ہم دردوں کی مداخلت سے طے ہو جائے۔ ارشاد فرمایا ہے:

وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا، فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَ حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا۔ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا، يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا۔ (النساء ۴: ۳۵)

”اور اگر تمھیں میاں بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو تو ایک حکم مرد کے لوگوں میں سے اور ایک عورت کے لوگوں میں سے مقرر کر دو۔ اگر (میاں اور بیوی) دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ اُن کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ بے شک، اللہ علیم و خبیر ہے۔“

آیت کے آخر میں اگر غور کیجیے تو نہایت بلیغ اسلوب میں میاں بیوی کو ترغیب دی ہے کہ انھیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ وہ اگر افتراق کے بجائے سازگاری چاہیں گے تو ان کا پروردگار بڑا کریم ہے۔ اس کی توفیق ان کے شامل حال ہو جائے گی۔

طلاق کا حق

سورہ کی ابتدا 'اذا طلقتم النساء' کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد یہاں بھی اور قرآن کے بعض دوسرے

---

۲۶ المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، جواد علی ۵/۵۴۸۔

مقامات پر بھی طلاق کے احکام جہاں بیان ہوئے ہیں، اس فعل کی نسبت مرد ہی کی طرف کی گئی ہے۔ پھر بقرہ (۲) کی آیت ۲۳۷ میں قرآن نے شوہر کے لیے 'الذی بیدہ عقدۃ النکاح' (جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ طلاق کا اختیار شریعت نے مرد کو دیا ہے۔ اس کی وجہ بھی بالکل واضح ہے۔ عورت کی حفاظت اور کفالت کی ذمہ داری ہمیشہ سے مرد پر ہے اور اس کی اہلیت بھی قدرت نے اسے ہی دی ہے۔ قرآن نے اسی بنا پر اسے قوام قرار دیا اور بقرہ ہی کی آیت ۲۲۸ میں بہ صراحت فرمایا ہے کہ 'للرجال علیھن درجۃ' (شوہروں کو ان پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے)۔ چنانچہ ذمہ داری کی نوعیت اور حفظ مراتب، دونوں کا تقاضا ہے کہ طلاق کا اختیار بھی شوہر ہی کو دیا جائے۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ خاندان کا ادارہ انسان کی ناگزیر ضرورت ہے۔ ذمہ داریوں کے فرق اور وصل و فصل کے یکساں اختیارات کے ساتھ جس طرح دنیا کا کوئی دوسرا ادارہ قائم نہیں رہ سکتا، اسی طرح خاندان کا ادارہ بھی نہیں رہ سکتا۔ عورت نے اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت و کفالت کے عوض اگر اپنے آپ کو کسی مرد کے سپرد کر دینے کا معاہدہ کر لیا ہے تو اسے ختم کر دینے کا اختیار بھی اس کی رضامندی کے بغیر عورت کو نہیں دیا جا سکتا۔ یہی انصاف ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری صورت اگر اختیار کی جائے گی تو یہ بے انصافی ہو گی اور اس کا نتیجہ بھی لامحالہ یہی نکلے گا کہ خاندان کا ادارہ بالآخر ختم ہو کر رہ جائے گا۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ عورت اگر علیحدگی چاہے گی تو وہ طلاق دے گی نہیں، بلکہ شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے گی۔ عام حالات میں توقع یہی ہے کہ ہر شریف النفس آدمی نباہ کی کوئی صورت نہ پا کر یہ مطالبہ مان لے گا، لیکن اگر ایسا نہ ہو تو عورت عدالت سے رجوع کر سکتی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ جائے تو عدالتوں کے لیے اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ یہ ہے کہ اتنی بات اگر متحقق ہو جاتی ہے کہ عورت اپنے شوہر سے بے زار ہے اور اس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی تو شوہر کو حکم دیا جائے کہ اس نے مہر کے علاوہ کوئی مال یا جائداد اگر بیوی کو دی ہوئی ہے اور وہ اسے واپس لینا چاہتا ہے تو واپس لے کر اسے طلاق دے دے۔

سیدنا ابن عباس کی روایت ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا: یا رسول اللہ میں اس کے دین و اخلاق پر کوئی حرف نہیں رکھتی، مگر مجھے اسلام میں کفر کا اندیشہ ہے۔[۲۷] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ شکایت سنی تو فرمایا: اس کا باغ واپس کرتی ہو؟ اس نے مان لیا تو آپ نے ثابت کو حکم دیا کہ باغ لے لو اور اسے ایک طلاق دے کر الگ کر دو۔[۲۸]

[باقی]

---

۲۷ اس جملے کا مطلب دوسری روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ثابت کی صورت پسند نہ تھی اور وہ محسوس کرتی تھیں کہ اس کے باوجود اگر وہ اس کے ساتھ رہیں تو اندیشہ ہے کہ ان احکام کی پابند نہ رہ سکیں گی جو شوہر سے وفاداری اور عفت و عصمت کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو دیے ہیں۔

۲۸ بخاری، رقم ۵۲۷۳۔

جاوید احمد غامدی/منظور الحسن

[مدیر ''اشراق'' اپنے ہفتہ وار درسِ قرآن و حدیث کے بعد شرکا کے سوالوں کے جواب دیتے رہے ہیں، یہاں ہم ان میں سے بعض سوال و جواب مرتب کر کے پیش کر رہے ہیں۔ نائب مدیر]

دعوت اور قرآن کا تعلق

سوال: غامدی صاحب ہماری دعوت بالعموم ہمارے اس فہم پر مبنی ہوتی ہے جو ہم آپ کے افکار سے حاصل کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ آپ کے افکار آپ کے اپنے فہم ہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس صورت میں ہماری دعوت قرآنِ مجید کی دعوت کس طرح بن سکتی ہے؟

جواب: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دعوت ہمیشہ قرآن مجید ہی کی طرف ہونی چاہیے، لیکن قرآنِ مجید کی دعوت کو پیش کرنے کا کام اصحابِ علم ہی انجام دے سکتے ہیں۔ قرآنِ مجید کے فہم کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے انسان کو ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ یہ صلاحیت پیدا کرنے کے بعد ہی کوئی شخص قرآن کے درس و تدریس اور ترجمہ وتفسیر کی خدمت انجام دے سکتا ہے۔ یہی طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔

جو اصحابِ علم دین کے بارے میں رہنمائی کرتے ہیں، وہ بہر حال اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے دین کو اخذ کرنے کے لیے کچھ اصول بھی متعین کیے ہوتے ہیں۔ ان کے کام پر ایک عمومی اعتماد ہی آپ کو ان سے وابستہ کرتا ہے۔ ہر صاحبِ علم جب اپنا نقطۂ نظر پیش کرے گا تو اس کے دلائل دے گا۔ آپ اگر ان دلائل پر مطمئن ہیں تو اسے قبول کیجیے اور اگر آپ کو اطمینان نہیں ہے تو اسے قبول نہ کیجیے۔ لیکن جہاں تک دین کی دعوت کا تعلق ہے تو وہ قرآن اور سنت کو لوگوں تک پہنچانے کا نام ہے۔ دعوت کی بنیاد ہر حال میں انھی کو بننا چاہیے۔ قرآن وسنت کے علاوہ آپ جس چیز کو بھی دعوت کا موضوع بنائیں گے، وہ محض فرقہ بندیوں کا باعث بنے گی۔ البتہ آپ جن اہلِ علم پر اعتماد کرتے ہیں یا جن سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں، ان کی تحریروں یا تقریروں سے لوگوں کو متعارف کرانے میں کوئی حرج کی بات نہیں۔ اس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے کہ کسی نقطۂ نظر کے بارے میں جو فہم آپ کو حاصل ہے، وہ دوسروں کو بھی حاصل ہو جائے۔

دینی جماعتوں میں اتحاد

سوال: دینی جماعتوں اور مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان اتحاد کیسے ممکن ہے؟

جواب: یہ مسئلہ میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ مختلف نقطۂ نظر کے حامل لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ دین کی دعوت کا کام بہر حال اہلِ علم کو کرنا ہے۔ اہلِ علم کے مابین دین کی تعبیر کے بارے میں کچھ اختلاف بھی ہو گا۔ اس اختلاف پر دین نے کوئی پابندی نہیں لگائی۔ یہ علمی اختلاف صحابۂ کرام کے درمیان بھی موجود رہا ہے۔ چنانچہ ہر صاحبِ فکر کو اپنی بات دلائل کے ساتھ پیش کرنی چاہیے اور عام آدمی کو دلائل ہی کی بنیاد پر اس کی بات کو رد یا قبول کرنا چاہیے۔ اس وجہ سے میں نہیں سمجھتا کہ دین کی تفہیم کے کاموں میں کسی نوعیت کے اتحاد کی ضرورت ہے۔ آپ جیسے ہی اس کے لیے کوشش کریں گے، حق کے بارے میں گریز اور منافقت کے رویے کا شکار ہو جائیں گے۔ جبکہ دعوت کی ذمہ داری میں بنیادی چیز یہی ہے کہ آپ حق کی سچی شہادت دیں اور صاف صاف طریقے سے اس کو واضح کریں۔

اس وجہ سے میرے نزدیک اس معاملے میں ہمیں کسی اتحاد کی ضرورت نہیں، بلکہ مختلف دینی آرا کے بارے میں رواداری کا رویہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اختلافِ رائے کو ذاتی عناد اور دشمنی کی بنیاد نہ بنائیں اور اس کی بنا پر فرقہ بندیوں کی دیواریں کھڑی نہ کریں۔ اتحاد قومی اور سیاسی مسائل کے حل کے لیے ہونا چاہیے۔ ان امور میں اگر مختلف گروہ یا جماعتیں چند نکات پر متفق ہو جاتی ہیں تو یہ خیر کی بات ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اردو کی منتخب تفاسیر

سوال: دعوت کا کام کرتے ہوئے کیا ہم کسی شخص کو مولانا مودودی صاحب کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' پڑھنے کا مشورہ دے سکتے ہیں؟

جواب: جو شخص قرآنِ مجید کی زبان سے واقف نہیں ہے وہ لازماً ترجمہ اور تفسیر ہی کے ذریعے سے قرآنِ مجید کو سمجھے گا۔ ایسے شخص کو یہی مشورہ دینا چاہیے کہ وہ ممکن حد تک زیادہ سے زیادہ تفسیروں کا بغور مطالعہ کرے۔ اس کے بعد جن آرا پر اس کا اطمینان ہو جائے انھیں وہ اختیار کر لے۔ آپ اسے اردو زبان میں نمائندہ تفسیروں کا انتخاب کر کے دیں تو یہ اس کے لیے

زیادہ مفید ہوگا۔مثال کے طور پر آپ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی ''بیان القرآن''، مفتی محمد شفیع صاحب کی ''معارف القرآن''، مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی ''تفہیم القرآن''اور مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کی ''تدبرِ قرآن'' مطالعے کے لیے تجویز کر سکتے ہیں۔

حافظِ قرآن کے توسط سے جنت میں جانا

سوال: ایک روایت میں آیا ہے کہ ایک باعمل حافظِ قرآن اپنے ساتھ دس افراد کو جنت میں لے جا سکتا ہے۔اس روایت کی کیا حقیقت ہے؟

جواب: یہ کوئی ثابت شدہ روایت نہیں ہے۔ ایسی بہت سی روایات فضائل کے باب میں بیان کی جاتی ہیں۔ اور بسا اوقات اس طرح بیان ہوتی ہیں کہ دین کی اساسات کو متاثر کر دیتی ہیں۔اس سلسلے میں یہ بات بہت اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ قیامت میں فیصلہ اصلاً عمل کی بنیاد پر ہوگا۔ یہ دیکھا جائے گا کہ ایمان انسان کے اندر کتنا جاگزیں ہے اور اس نے اس کے تقاضوں کو کس حد تک پورا کیا ہے۔ فیصلے کی اصل بنیاد یہی ہے۔ باقی سب چیزیں اس کے بعد مؤثر ہوتی ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اپنا اور اپنے اہل وعیال کا تزکیہ

سوال: تزکیۂ نفس کسے کہتے ہیں؟ تزکیہ کون کرتا ہے؟ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا تزکیہ کیسے کرنا چاہیے؟

جواب: دین کا مقصود تزکیۂ نفس ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو آلایشوں سے پاک کر کے ان کے فکر و عمل کو صحیح سمت میں نشو و نما دی جائے۔ اللہ نے اپنے پیغمبر اسی مقصد کے لیے بھیجے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس اصول پر بنائی ہے کہ یہاں پر انسان اپنے نفس کی آلایشوں کو دور کرنے کی سعی کرے اور پیغمبروں کی تعلیمات کی رہنمائی میں اپنی ایسی تربیت کرے کہ جنت میں آباد ہونے کے قابل ہو جائے۔ جنت میں آباد ہونے کے لیے بنیادی شرط ہی تزکیہ نفس ہے۔ارشادِ خداوندی ہے:

''(اس وقت)، البتہ کامیاب ہوا وہ جس نے اپنا تزکیہ کیا اور اپنے پروردگار کا نام یاد کیا، پھر نماز پڑھی۔ (نہیں)، بلکہ تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، دراں حالیکہ آخرت (اس کے مقابلے میں) بہتر بھی ہے اور پائدار بھی۔''

قرآنِ مجید انسان کے علم اور عمل دونوں کا تزکیہ کرتا ہے۔قرآن علم کے تزکیے کے لیے جو تعلیم دیتا ہے اسے اپنی اصطلاح میں ''حکمت'' سے تعبیر کرتا ہے اور جو تعلیم عمل کے تزکیے لیے دیتا ہے اسے ''شریعت'' سے تعبیر کرتا ہے۔بس یوں سمجھ لیجیے کہ جو ہدایات ایمانیات کے بارے میں ہیں، وہ علم کا تزکیہ کرتی ہیں اور جو ہدایات قانون اور ضابطوں سے متعلق ہیں، وہ عمل کا تزکیہ کرتی ہیں۔مثال کے طور پر جب قرآنِ مجید شرک کی تردید کرتا ہے تو وہ ذاتِ خداوندی کے بارے میں ہمارے علم کا تزکیہ کرتا ہے اور جب خالص اسی کی عبادت میں سرگرمی کی ترغیب دیتا ہے تو عمل کا تزکیہ کرتا ہے۔اس سے واضح ہوا کہ تزکیہ دین کرتا ہے، کوئی انسان نہیں کرتا۔ ہر زمانے میں بہت سے اہلِ علم پیدا ہوتے ہیں۔ان سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔اللہ کی کتاب بالکل محفوظ شکل میں ہمارے پاس موجود ہے، اس کا مطالعہ کر کے یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ کون سی بات صحیح اور کون سی بات غلط ہے۔کوئی عالم یا دینی تربیت کرنے والا صرف یہ کام کرتا ہے کہ وہ آپ کو دین کی تعلیمات سے آگاہ کرتا ہے اور دینی ماحول اور اچھی صحبت فراہم کرتا ہے۔گویا وہ بذاتِ خود ہمارا تزکیہ نہیں کرتا، بلکہ تزکیہ کرنے والے دین سے ہمیں وابستہ کر دیتا ہے۔یعنی وہ مزکی (تزکیہ کرنے والا) نہیں ہوتا، بلکہ معلم (تعلیم دینے والا) ہوتا ہے۔

جن اصحابِ علم پر آپ کو اعتماد ہے، ان سے دین سیکھیے۔جب آپ دین کو سمجھ لیں گے تو پھر آپ کی فطرت بیدار ہو گی اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ کو اپنے علم اور عمل کو کن کن چیزوں سے پاک کرنا ہے۔جہاں تک اپنے اہل وعیال کا تعلق ہے تو ان کی آخرت کے بارے میں آپ کو لازماً فکر مند ہونا چاہیے۔ان کو تزکیۂ نفس کی منزل تک پہنچانے کے لیے آپ کو جدوجہد کرنی چاہیے، لیکن اس جدوجہد کا واحد راستہ دینی تعلیم وتربیت اور صالحین کی صحبت ہے۔دینی تعلیم خود بھی حاصل کیجیے اور اپنے اہلِ خانہ کے لیے بھی اس کا بندوبست کیجیے۔دین کے معلمین کی مجالس میں بیٹھیے اور ان لوگوں کی صحبت اختیار کیجیے جنھوں نے اپنی زندگی کو دین کے سانچے میں ڈھالا ہوا ہے۔اپنے اہل وعیال اور احباب کو بھی صاحبِ کردار علما کی صحبت میں بیٹھنے کی ترغیب دیجیے۔گھر والوں کو نماز کا پابند بنائیے اور ان کے دل ودماغ میں یہ شعور پیدا کیجیے کہ آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔اس دنیا کی زندگی بہت مختصر ہے اور یہ محض ایک آزمایش ہے۔ان کے ذہنوں میں، ان کے دلوں میں یہ بات ڈال دیجیے کہ آخرت کی کامیابی صرف اور صرف انھی لوگوں کو نصیب ہو گی جو اس دنیا میں خدا کے دین کی طرف متوجہ ہوں گے اور اپنے علم وعمل کو آلایشوں سے پاک کر لیں گے۔

انسانی اعضا کا عطیہ

سوال: مرنے سے پہلے انسان اپنے جسمانی اعضا کے عطیے کی وصیت کر سکتا ہے؟

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جواب: دین میں اس کے متعلق کوئی منفی یا مثبت بات بیان نہیں ہوئی۔ اس کے ناجائز ہونے کے بارے میں بعض علما نے جو دلائل دیے ہیں، ان میں، میرے نزدیک کوئی دلیل بھی ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر اسے ممنوع قرار دیا جائے۔ اس لیے اس معاملے میں خاموشی اختیار کرنی چاہیے۔ جو شخص اس کو جائز سمجھتا ہے وہ اپنے اعضا کے عطیے کی وصیت کر سکتا ہے۔

رفع یدین

سوال: نماز میں رفع یدین کے بارے میں آپ کا کیا نقطۂ نظر ہے؟ بعض لوگوں کے نزدیک یہ صحیح احادیث سے ثابت ہے اور قرآنِ مجید میں بھی اس کے خلاف کوئی بات نہیں ہے، وضاحت فرما دیجیے؟

جواب: میرے نزدیک صرف وہی چیزیں سنت کی حیثیت رکھتی ہیں جو صحابۂ کرام کے اجماع سے ہم تک منتقل ہوئی ہیں۔ ہم انھی چیزوں پر اصرار کر سکتے ہیں اور ان کی خلاف ورزی پر لوگوں کو توجہ بھی دلا سکتے ہیں۔ جن امور میں صحابۂ کرام کا اجماع نہیں ہے، انھیں نہ سنت کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے اور نہ ان پر عمل کے لیے اصرار کیا جا سکتا ہے۔ میری تحقیق کے مطابق رفع یدین بھی ان چیزوں میں شامل ہے جن پر صحابہ کا اجماع نہیں ہو سکا، اس وجہ سے میں اسے سنت نہیں سمجھتا۔ اس کے بعد چاہے ساری دنیا متفق ہو کر اسے سنت قرار دینے لگے تو میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یتیم پوتے کی وراثت

سوال: یتیم پوتے کی وراثت کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اس بارے میں قرآن وسنت کے کیا دلائل ہیں؟

جواب: یتیم پوتے کی وراثت کے بارے میں قرآن وسنت بالکل خاموش ہیں۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں بھی اس کے متعلق کوئی بات وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کی گئی۔ اس سلسلے میں ہمارے علما نے قرآنِ مجید کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اجتہاد کیا ہے۔ اس لیے یہ بالکل ایک اجتہادی نوعیت کا معاملہ ہے۔ اس وجہ سے اس میں اگر کوئی اختلافِ رائے ہو تو اس سے گھبرانا نہیں چاہیے اور اسے قرآن وسنت کی تردید یا تقلید کا مسئلہ بھی نہیں بنانا چاہیے۔ جس رائے پر اطمینان ہو، اس کو اختیار کر لینا چاہیے۔ جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے تو میں میراث میں یتیم پوتے کا حق مانتا ہوں۔

نماز کے بارے میں اختلافات

سوال: کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں مختلف طریقوں سے نماز ادا کی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو مسلمانوں میں نماز کے بارے میں عملی اختلافات کیوں پائے جاتے ہیں؟

جواب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نماز مسلمانوں کو سکھائی، اس میں دو طرح کے امور ہیں۔ ایک وہ امور ہیں جنھیں آپ نے سنت کی حیثیت سے جاری فرمایا ہے۔ یہ نماز کے لازمی اجزا ہیں اور ان میں کسی تبدیلی کی گنجایش نہیں ہے۔ مثال کے طور پر نمازوں کی تعداد، ان کے اوقات، اذان کے الفاظ، نمازوں کی رکعتیں، قیام میں سورۂ فاتحہ اور قرآن کے کچھ حصے کی تلاوت، رکوع کا طریقہ، سجدے کا طریقہ اور تکبیرِ تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانا وغیرہ۔

دوسرے امور وہ ہیں جنھیں آپ نے سنت کی حیثیت سے جاری نہیں فرمایا، بلکہ کچھ اصولی ہدایات دے کر انھیں لوگوں کے اختیار پر چھوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر ثنا، قعدے میں پڑھی جانے والی دعائیں، حضور کے لیے دعا (درود)، قیام کی صورت میں ہاتھ باندھنا، سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد آمین کہتے ہوئے اپنی آواز کو بلند یا پست رکھنا اور تکبیریں کہتے ہوئے ہاتھ اٹھانا وغیرہ۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پہلی نوعیت کے امور میں امت میں ہمیشہ اتفاق رہا ہے اور یہی وہ معاملات ہیں جن پر ہمیں اصرار کرنا چاہیے۔ جہاں تک دوسری نوعیت کے امور کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں ہم اپنے ذوق کے مطابق کوئی چیز اختیار کر سکتے ہیں۔ یہی وہ امور ہیں جن میں علما کی آرا مختلف رہی ہیں۔ ان اختلافات سے نماز کی اصل ہیئت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ ان معاملات کو چونکہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے اختیار پر چھوڑ دیا ہے، اس لیے ہمیں بھی ان میں سے کسی چیز پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔

ان معاملات کو جنھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت کے طور پر جاری نہیں فرمایا یا جن کے بارے میں لوگوں کو اختیار دیا، انھیں چند مثالوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک مرتبہ حضور نے دیکھا کہ ایک صحابی قعدے میں دعا کے موقع پر اس طرح کے کلمات ادا کر رہے ہیں: 'السلام علی اللّٰہ' یعنی اللہ پر سلامتی ہو۔ حضور نے انھیں سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ تو سراسر سلامتی ہیں۔ انسانوں کا ان کے لیے سلامتی کی دعا کرنا بے ادبی کے مترادف ہے۔ پھر آپ نے ''التحیات'' کے کلمات سکھائے۔ گویا ایسا نہیں ہوا کہ حضور نے ابتدائی طور پر نماز سکھاتے ہوئے ''التحیات'' سکھائی ہو، بلکہ ایک غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے آپ نے اللہ تعالیٰ کے حضور سلام پیش کرنے کا صحیح اسلوب بتایا۔

سورۂ فاتحہ سے پہلے ثنا پڑھنے کا معاملہ بھی اسی طرح کا ہے۔لوگوں نے محسوس کیا کہ حضور امامت کرتے وقت سورۂ فاتحہ کی تلاوت سے پہلے کچھ دیر خاموش کھڑے رہتے ہیں۔انھوں نے آپ سے اس کی وجہ دریافت کی۔آپ نے فرمایا کہ میں نماز شروع کرتے وقت پروردگار کے حضور میں اپنی طرف سے کچھ حمد وثنا کے کلمات پیش کرتا ہوں۔لوگوں نے سیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے انھیں 'سبحانک اللھم وبحمدک ......' اور اس طرح کے بعض دوسرے کلمات سکھائے۔پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دعا یعنی درود بھی لوگوں نے اسی طرح سیکھا۔

ان مثالوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نماز کے بعض حصوں کو حضور نے سنت کے طور پر جاری نہیں فرمایا۔ان کی حیثیت اختیاری ہے۔ان اختیاری امور میں ہر مسلمان فطری طور پر چاہے گا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مختارات جاننے کی کوشش کرے۔نہیں جان سکے گا تو لازماً اجتہاد کرے گا۔اس میں ظاہر ہے کہ اختلاف ایک فطری بات ہے۔

بیرونِ ملک بذریعہ ہنڈی رقم بھجوانا

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سوال: کیا بیرونِ ملک اپنی رقم بذریعہ ہنڈی بھجوائی جا سکتی ہے؟ اس کی ضرورت اس لیے پڑتی ہے کہ بینک بالعموم ڈالر یا درہم کا ریٹ کم کر کے اور تاخیر سے ادائیگی کرتے ہیں۔

جواب: اس معاملے کا تعلق دین یا شریعت سے نہیں، بلکہ ملکی قانون سے ہے۔اگر ملکی قانون میں اس کی گنجایش ہے تو آپ یہ طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔اگر ملکی قوانین اس کی اجازت نہیں دیتے تو پھر ہرگز یہ طریقہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ملکی قانون کی خلاف ورزی جس طرح نظمِ ریاست میں جرم ہے، اسی طرح شریعت میں بھی جرم ہے۔

ملکۂ سبا کا تخت

سوال: قرآنِ مجید کے مطابق ایک شخصیت نے ملکۂ سبا کا تخت حضرت سلیمان علیہ السلام کے سامنے پلک جھپکتے میں حاضر کر دیا تھا۔یہ کام کس علم کے تحت انجام دیا گیا؟

جواب: موجودہ زمانے میں لوگوں کو اس پر تعجب کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔مادی علوم پر کچھ دسترس حاصل کرنے کے بعد ہم ہزاروں میل دور ہونے والے عمل کو اسی وقت اپنے سامنے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔کسی شخص کی تصویر، گفتگو اور حرکات

وسکنات براہِ راست ہم تک پہنچ رہی ہوتی ہیں۔ کمپیوٹر کی ایجاد جو معجزے دکھا رہی ہے، چند سال پہلے ان کا تصور ہی کیا جا سکتا تھا۔ موجودہ زمانے میں جس طرح مادی علوم حیرت انگیز کارنامے انجام دے رہے ہیں، قدیم زمانے میں اسی طرح کے کارنامے نفسی علوم کے ذریعے سے انجام دیے جاتے تھے۔ چنانچہ جس طرح مادی علوم کا دین سے کوئی تعلق نہیں، اسی طرح نفسی علوم کا بھی دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو صاحب ملکۂ سبا کا تخت لے کر آئے، ان کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے کہ: ''ان کے پاس قانونِ خداوندی کا ایک علم تھا۔'' ہو سکتا ہے کہ دورِ جدید کے مادی علوم بھی کبھی اس مقام پر پہنچ جائیں کہ ہمارے سامنے پڑی ہوئی چیز چشم زدن میں امریکہ اور آسٹریلیا پہنچ جائے۔ ان صاحب کے کارنامے کی نوعیت ایسی ہی ہے جیسی ہمارے زمانے میں کسی موجد یا سائنس دان کے کسی کارنامے کی ہے۔

''اقامتِ دین'' کا مفہوم

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سوال: قرآنِ مجید کی اصطلاح ''اقامتِ دین'' کا کیا مفہوم ہے؟

جواب: ''اقامتِ دین'' کا مفہوم ہے دین کو پوری طرح اختیار کرنا۔ یعنی دین کو اس کی روح اور اس کے قالب کے لحاظ سے اپنا لینا۔ ''اقامتِ دین'' کے الفاظ میں لفظِ اقامت کے وہی معنی ہیں جو ''اقامتِ صلٰوۃ'' میں اس لفظ کے ہیں۔ تاریخِ اسلام کے جید علما نے ہر زمانے میں ان الفاظ کے یہی معنی بیان کیے ہیں۔ موجودہ زمانے میں بعض اہلِ علم نے ان الفاظ سے مختلف معنی اخذ کرنے کی جو کوشش کی ہے، وہ محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔

نظمِ قرآن

سوال: نظمِ قرآن سے کیا مراد ہے؟

جواب: نظمِ قرآن کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ مجید میں تمام سورتیں موضوعات کی ایک خاص ترتیب کے ساتھ رکھی گئی ہیں۔ ہر سورہ اپنا ایک خاص موضوع رکھتی ہے۔ اس موضوع کے مطالب ایک خاص ترتیب کے ساتھ بیان ہوتے ہیں۔ ہر سورہ کی ایک تمہید ہوتی ہے اور ایک خاتمہ ہوتا ہے۔ ہر آیت اپنا ایک سیاق وسباق رکھتی ہے۔ اس طرح قرآنِ مجید ایک منظّم، مرتب اور مربوط کتاب کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی نوعیت اقوال کے کسی ایسے مجموعے

کی نہیں ہے جس کے ہر قول کے مختلف مطالب اخذ کیے جا سکتے ہوں، بلکہ اس کی نوعیت ایک ایسی منظّم کتاب کی ہے جس کا ہر جملہ اپنا ایک متعین مفہوم اور طے شدہ پیغام رکھتا ہے۔

احادیث کی تدوین

سوال: احادیث کی تدوین کب شروع ہوئی اور اس کا محرک کیا تھا، بعض جلیل القدر صحابہ سے کم روایات کیوں منقول ہیں؟

جواب: احادیث کی تدوین صحابۂ کرام کے زمانے ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ بعض اصحاب نے اپنے چھوٹے چھوٹے مجموعے بھی مرتب کر لیے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ کام ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر گیا اور تقریباً ڈھائی تین سو سال میں یہ کام منظّم مجموعوں کی شکل میں مرتب ہو گیا۔ جہاں تک اس کام کے محرکات کا تعلق ہے تو یہ بات ہم سب پر واضح ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کوئی معمولی ہستی نہیں تھے۔ جس ہستی کے جسمِ اطہر سے چھو کر ٹپکنے والے پانی کے قطروں کو لوگ زمین پر نہیں گرنے دیتے تھے، اس کی زبان سے نکلنے والے لافانی الفاظ سے وہ کیونکر صرفِ نظر کر سکتے تھے۔ لوگ تو ہم آپ جیسوں کی باتوں کو محفوظ کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ وہ ہستی تو پیغمبر کی ہستی تھی۔ ہم جیسے تو ان کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں ہیں۔ جو لوگ ان کے زمانے میں موجود تھے، انھوں نے بالکل فطری طور پر آپ کے علم و عمل کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔ بلاشبہ انسانیت پر یہ ان کا عظیم احسان ہے۔ آپ کے علم و عمل کی روایات کو آگے بیان کرنے میں بعض لوگ البتہ، بے حد احتیاط کا طریقہ اختیار کرتے تھے۔ مثال کے طور پر سیدنا ابوبکر صدیق اور سیدنا عمرِ فاروق اس معاملے میں حد درجہ محتاط تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے بہت کم روایات بیان ہوئی ہیں۔

عورتوں کا بال ترشوانا

سوال: کیا عورتوں کا بال ترشوانا جائز ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں مردوں سے مشابہت ہو جاتی ہے، لیکن یہ بات دل کو نہیں لگتی۔

جواب: عورتوں کے بال ترشوانے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ بال تراش کر ایسی ہیئت نہیں بنانی چاہیے کہ عورت مرد

کے مشابہ محسوس ہو۔اسی طرح مردوں کو بھی ایسے بال نہیں رکھنے چاہییں کہ وہ عورتوں جیسے لگیں۔ یہ طرزِ عمل فطرت کے خلاف ہے۔اور ہر خلافِ فطرت چیز اللہ کو ناپسند ہے۔

قرآن کا مردوں کو زیادہ اہمیت دینا

سوال: میری بہن کو اس بات کا بہت گلہ ہے کہ قرآن نے مردوں ہی کو کیوں زیادہ مخاطب کیا ہے، جبکہ خواتین زیادہ نازک اور حساس طبیعت کی مالک ہوتی ہیں۔ انھیں اسلام میں دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا ہے، حالانکہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے وہ مردوں کے برابر ہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں تھا کہ جنت میں عورتوں کو ملنے والی نعمتوں کو عورتوں ہی کے حوالے سے بیان کیا جاتا، جیسا کہ مردوں کے لیے حوروں کا ذکر کیا گیا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ اپنا پیغام دنیا تک پہنچانے کے لیے کوئی نئی زبان ایجاد نہیں کرتے، بلکہ جس قوم میں وہ اپنا پیغام نازل کرتے ہیں، اسی کی زبان کو اظہار کا ذریعہ بناتے ہیں۔ دنیا کی زبانوں میں مرد و عورت کو مشترک طور پر مخاطب کرنے کے لیے مذکر ہی کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جب قرآنِ مجید یہ صیغہ استعمال کرتا ہے تو عورتیں مردوں کے ساتھ شامل ہوتی ہیں۔

یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ مردوں کے لیے جنت کی کچھ خاص نعمتیں ہیں۔ عورتوں کے لیے بھی اسی طرح جنت کی نعمتیں ہیں جس طرح مردوں کے لیے ہیں۔ جہاں تک ازواج کا تعلق ہے تو اس کے لیے قرآن نے ازواجِ مطہرہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طرفین کے لیے پاکیزہ جوڑے ہوں گے۔ اس کے بجائے اگر یہ بات کہی جاتی کہ وہاں عورتوں کو دس دس مرد ملیں گے تو آپ خود سوچیے کہ کیا یہ کوئی شایستہ اسلوب ہوتا؟ میرا خیال ہے کہ ہماری بہنوں کو شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی عفت کا لحاظ کرتے ہوئے ساری بات ایک جملے میں بیان کر دی ہے۔

قضا نمازوں کی تسبیحات سے تلافی

سوال: کئی کتابوں میں پڑھا ہے کہ قضا نمازوں کے لیے اگر چند خاص نمازوں میں بعض تسبیحات پڑھ لی جائیں تو ان سے قضا نمازوں کی تلافی ہو سکتی ہے۔ کیا یہ بات درست ہے؟

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جواب: قضا نمازوں کے حوالے سے علماے امت میں، بالعموم دو ہی مسلک پائے جاتے ہیں: ایک یہ کہ آپ ہر فرض نماز کو ادا کرتے ہوئے، نوافل کی جگہ پر یا ان کے علاوہ قضا نماز بھی پڑھ لیں۔ دوسرے یہ کہ آپ اپنی کوتاہی پر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر معافی مانگیں اور آیندہ کوتاہی نہ کرنے کا عہد کریں اور اس کے بعد امید رکھیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی توبہ قبول فرمائیں گے۔ ان دونوں طریقوں کے اپنے اپنے دلائل ہیں۔ آپ ان میں سے کسی پر بھی عمل کر سکتے ہیں۔ یہ بات، البتہ درست نہیں ہے کہ بعض تسبیحات قضا نمازوں کی تلافی کر سکتی ہیں۔

لڑکے اور لڑکی کی محبت کا جواز

سوال: کیا اسلام کے مطابق لڑکے اور لڑکی کی محبت جائز ہے؟

جواب: جہاں تک کسی سے محبت ہو جانے کا تعلق ہے تو اس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر اس کا تعلق انسان کے شعوری فیصلے سے نہیں ہوتا۔ البتہ، اگر محبت ہو گئی ہے تو اس کے اظہار کے لیے جو آداب ملحوظ رہنے چاہییں، اسلام ان کی طرف متوجہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کن حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں بنیادی باتیں بس یہی ہیں کہ:

۱۔ حیا کا دامن کسی حال میں بھی نہیں چھوٹنا چاہیے۔

۲۔ نکاح سے قبل ہر طرح کا جسمانی تعلق ممنوع ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضور سے زیادہ نمازیں پڑھنا

سوال: آپ نے اپنے ایک درس میں فرمایا تھا کہ آدمی کو اتنی ہی نمازیں پڑھنی چاہییں جتنی حضور نے پڑھی ہیں۔ لیکن حضور کی زندگی میں تو گناہ بہت کم تھے، جبکہ ہماری زندگیاں گناہوں سے بھری پڑی ہیں۔ اس وجہ سے کیا ہمیں زیادہ نمازیں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے؟

جواب: اسی طرح کا سوال جب بعض لوگوں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح تم لوگ بدعتیں پیدا کر لو گے۔ میں خدا سے، تمھارے مقابلے میں زیادہ ڈرنے والا ہوں۔ تم کو جو نیکی بھی کرنی ہے، وہ

میری سنت اور میرے اسوہ کے مطابق کرو۔ چنانچہ ہمیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔

حکمرانوں کی اصلاح

سوال: حکمرانوں کی اصلاح کا کام انفرادی سطح پر ہونا چاہیے یا اس کے لیے اجتماعی سطح پر تنظیم سازی ہونی چاہیے؟

جواب: اس کا انحصار آپ کی اپنی صلاحیت اور آپ کے حالات پر ہے۔ اگر آپ یہ کام انفرادی طور پر کرنا چاہتے ہیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ ہماری تاریخ میں امت کے اکابرین نے زیادہ تر انفرادی سطح ہی پر کام کیا ہے۔ اگر آپ موجودہ جمہوری نظام میں کوئی تنظیم قائم کر کے یہ کام کرنا چاہتے ہیں تو یہ بھی بالکل جائز ہے۔ ان میں سے کوئی طریقہ نہ واجب ہے نہ فرض ہے۔ آپ کا فیصلہ اپنی صلاحیت، اپنے حالات اور اپنے تمدن کے تقاضوں کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

دین کے بنیادی نظریات کا اثبات

سوال: دین کے بنیادی نظریات نظری طور پر ہی ثابت ہو سکتے ہیں، کیا جزا و سزا کے لیے یہ بنیاد کافی ہے؟

جواب: دین کے بنیادی عقائد یعنی وجودِ باری اور آخرت کے اثبات کے بارے میں انسان کی فطرت کی شہادت ہے، کائنات کے مجموعی نظام کی گواہی ہے، انبیا علیہم السلام نے نہایت وضاحت کے ساتھ انسانوں کو ان سے آگاہ کیا ہے، تاریخِ انسانی نے قطعی حسی دلائل اس ضمن میں پیش کیے ہیں۔ کیا اس کے بعد انسان کے پاس کوئی عذر باقی رہ جاتا ہے؟

وضو کے دوران میں ریح کا اخراج

سوال: وضو کے دوران میں ریح خارج ہو جائے تو لوگ آلودہ مقام کے بجائے، پھر سے ہاتھوں اور دوسرے اعضا کو دھونا شروع کر دیتے ہیں، یعنی وضو کرنے لگتے ہیں۔ اس کی کیا حکمت ہے؟

جواب: جب ریح خارج ہو تو آپ کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ اور جب وضو ٹوٹ جائے گا تو پھر لازماً دوبارہ وضو کرنا ہوگا۔ ریح

خارج ہونے سے آلودگی کی نوعیت ایسی نہیں ہوتی کہ اسے دھونے کو ضروری قرار دیا جائے۔

درود شریف پڑھنے کی دینی حیثیت

سوال: کثرت سے درود شریف پڑھنے کی دینی حیثیت کیا ہے؟ نیز جو فضائل و برکات اور کمالات درود شریف سے منسوب کیے جاتے ہیں، وہ کس حد تک درست ہیں؟

جواب: درود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور میں رحمت و برکت اور بلندیِ درجات کی دعا ہے۔ یہ دعا آپ جتنی زیادہ کریں گے، وہ آپ لیے باعثِ اجر ہوگی۔ درود فارسی زبان کا لفظ ہے اور دعا ہی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ہم اپنے لیے دعا کرتے ہیں، اپنے اہل وعیال کے لیے دعا کرتے ہیں، اپنے والدین کے لیے دعا کرتے ہیں، اسی طرح ہم اپنے عظیم محسن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی دعا کرتے ہیں۔ یہ دعا آپ کے ایمان کی علامت ہے، حضور کے ساتھ آپ کے تعلق کی علامت ہے۔ حضور کے ساتھ تعلق دین ہے۔ حضور کے ساتھ تعلق کا اظہار دین ہے۔ حضور سے محبت دین ہے۔ باقی جہاں تک ان فضائل، برکات اور کمالات کا تعلق ہے جو اس ضمن میں بیان کیے جاتے ہیں تو ان میں سے کچھ چیزیں تو بے شک درست ہیں، لیکن زیادہ تر چیزیں محض افسانہ ہیں۔

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

قرآن کا صرف اردو ترجمہ پڑھنے کا اجر

سوال: اگر کوئی شخص عربی پڑھنا نہیں جانتا اور قرآنِ مجید کا صرف اردو ترجمہ پڑھ سکتا ہے تو کیا اسے اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا عربی میں قرآن کی تلاوت کرنے والے کو ملتا ہے؟

جواب: جی ہاں، اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا، کیونکہ وہ قرآنِ مجید کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس کی ہدایت کو پانے کی سعی کر رہا ہے۔ لیکن قرآن کی عربی کے اندر جو نور ہے اور اس کے ذریعے سے خدا کے ساتھ جو تعلق پیدا ہوتا ہے، اس کے حصول کے لیے اسے ہر ممکن کوشش کرنے چاہیے کہ قرآن کے الفاظ اس کی زبان پر جاری ہوں۔ جو شخص اردو پڑھ سکتا ہے، اس کے لیے تو قرآن کی عربی عبارت پڑھنے میں زیادہ مشکل نہیں ہونی چاہیے۔ تھوڑی سی رہنمائی کے بعد وہ بآسانی قرآن پڑھ سکے گا۔

گالی دینے سے وضو ٹوٹنا

سوال: کیا گالی دینے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے؟

جواب: گالی دینا بجائے خود اچھی بات نہیں ہے۔ گالی دینے سے اگرچہ وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن اگر کوئی شخص گالیاں دے کر نماز کے لیے کھڑا ہو گیا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ جتنا زیادہ پاکیزہ ہو کر خدا کے حضور میں کھڑا ہو گا، اس کی نماز اتنی ہی مقبول ہو گی۔ اس وجہ سے بہتر یہی ہے کہ وہ دوبارہ وضو کر لے۔

ٹیلی وژن کے مضر اثرات

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سوال: اب جبکہ ٹیلی وژن ہر گھر کا لازمی حصہ بن گیا ہے تو گھریلو خواتین کو اس کے مضر اثرات سے کیسے بچایا جا سکتا ہے؟

جواب: تمدن کے ارتقا کے نتیجے میں ٹیلی وژن نے جو سماجی اور معاشرتی حیثیت حاصل کر لی ہے، اس کے بعد اسے گھر سے نکالنا ناممکن ہو گیا ہے۔ اس طرح کی کوشش خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس صورتِ حال میں ہر شخص کو دو کام کرنے چاہییں: ایک یہ کہ وہ جب بھی موقع پائے کارپرداز لوگوں کو اس کے مضر اثرات سے آگاہ کرے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے اہلِ خانہ کے اندر خیر و شر کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ان کے دلوں میں جنت کی طلب پیدا کرے۔ انھیں سمجھائے کہ نفس کی یہ معمولی سی آلایش وہاں کتنے بڑے خسارے کا باعث بن جائے گی۔ آخرت کے صحیح شعور کو جب آپ اپنے اہلِ خانہ کے اندر اجاگر کر دیں گے تو یہ چیزیں آپ سے آپ بے معنی ہوتی چلی جائیں گی۔

صحیح مسالک

سوال: دین کے اعتبار سے کون کون سے مسالک صحیح ہیں؟

جواب: دین کے بارے میں جو مسالک، مکاتبِ فکر یا نقطہ ہاے نظر اس وقت موجود ہیں انھیں انسانوں ہی نے اپنے فہم کی روشنی میں قائم کیا ہے۔ان میں سے کسی مکتبِ فکر کی ضروری نہیں کہ ہر بات صحیح ہو اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر بات غلط ہو۔ علم وفکر کے اعتبار سے کسی بھی انسانی کاوش کو بالکلیہ صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ میں جو دین آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس کے بارے میں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتا کہ یہ سارے کا سارا لازماً صحیح ہوگا۔ میری اپنی تاریخ مجھے بتاتی ہے کہ میں نے اپنی قائم کی ہوئی بہت سی آرا سے رجوع کیا ہے۔ اب سے پہلے کسی رائے کو میں اپنے علم وعقل کے مطابق صحیح سمجھتا تھا اور پورے یقین کے ساتھ اس کو بیان کرتا تھا، آج میں اپنے علم وعقل کی روشنی میں اس رائے کو غلط سمجھتا ہوں۔ میرے ایمان ویقین کا معاملہ اصل میں میرے فہم کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس معاملے میں صحیح رویہ یہی ہے کہ ہمیں ہر وقت اپنے دل ودماغ کو کھلا رکھنا چاہیے اور اپنی رائے کے تعصب میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ مکاتبِ فکر کے بارے یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ فلاں مکتبِ فکر حقیقت کے زیادہ قریب ہے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں مکتبِ فکر سرتاسر حق ہے۔ حق کی حتمی حجت کی حیثیت صرف اور صرف اللہ کے پیغمبر کی بات کو حاصل ہے۔ اس کو معیار بنا کر آپ کسی بات کے رد یا قبول کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ڈش انٹینا پر پابندی

سوال: ڈش انٹینا کے ذریعے سے عریانی اور فحاشی کی وبا تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اس صورتِ حال میں کیا اس پر پابندی نہیں لگنی چاہیے؟

جواب: موجودہ زمانے میں سائنس نے جو غیر معمولی ترقی کر لی ہے، اس کے بعد اب اس طرح کی چیزوں پر پابندی لگانا عملی طور پر ممکن نہیں رہا۔ آپ ایک دروازہ بند کریں گے تو کئی چور دروازے کھل جائیں گے۔ اس لیے ہمیں اس طرح کی ایجادات سے گریز کے راستے تلاش کرنے کے بجائے اس بات کو ہدف بنا لینا چاہیے کہ ہم انھیں زیادہ سے زیادہ دینی مقاصد کے لیے استعمال کریں۔ میڈیا کی قوت کے ذریعے سے ہمیں دین کے پیغام کو دنیا تک پہنچانے کی جدوجہد کرنی چاہیے۔

ڈش انٹینا کا تعلیمی مقاصد کے لیے استعمال

سوال: کیا ڈش انٹینا کو تعلیمی اور معلوماتی مقاصد کے لیے لگایا جا سکتا ہے؟

جواب: اگر آپ اس پر کنٹرول کر سکیں اور گھریلو ماحول کو اس کے مفاسد سے محفوظ رکھ سکیں تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ بلا شبہ اس پر ایسے چینل موجود ہیں کہ اگر لوگ ان کا اچھا ذوق پیدا کر لیں تو وہ اس میڈیا کی دوسری غلاظتوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ جیسے ڈسکوری اور نیشنل جغرافیہ کے چینل ہیں، جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ کیا کیا قدرتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کارفرما کر رکھی ہیں، کیسی کیسی مخلوقات ہیں جو اس نے تخلیق کر رکھی ہیں، کیا کیا رعنائیاں ہیں جو اس نے کائنات میں بکھیر رکھی ہیں۔

کسی کو کافر قرار دینا

سوال: کیا اسلامی شریعت کے مطابق ہم کسی کو کافر قرار دے سکتے ہیں؟

جواب: اسلامی شریعت کے مطابق کسی شخص کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا، حتیٰ کہ کوئی اسلامی ریاست بھی کسی کی تکفیر کا حق نہیں رکھتی۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتی ہے کہ اسلام سے واضح انحراف کی صورت میں کسی شخص یا گروہ کو غیر مسلم قرار دے دے، کافر قرار دینے کا حق اس کو بھی نہیں ہے۔ دین کی اصطلاح میں کافر قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص پر اللہ کی حجت پوری ہو گئی ہے اور یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اس نے ضد، عناد اور ہٹ دھرمی کی بنیاد پر دین کا انکار کیا ہے۔ دین کی کامل وضاحت جس میں غلطی کا کوئی شائبہ نہ ہو، صرف اللہ کا پیغمبر اور ان کے تربیت یافتہ صحابہ ہی کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے اتمامِ حجت کے بعد تکفیر کا حق دین نے انھی کو دیا ہے۔ ان کے بعد دین کی کامل وضاحت چونکہ کسی فرد یا اجتماع کے بس کی بات نہیں ہے، اس لیے اب تکفیر کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔ ہم لوگوں کو اب اس کی جسارت بھی نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم کسی کے عقیدے کو باطل یا کفر سمجھتے ہیں تو ہمیں پوری دردمندی کے ساتھ اسے نصیحت کرنی چاہیے اور دلائل اور حکمت کے ساتھ اس کی غلطی واضح کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس سے زیادہ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

تزکیۂ نفس کا طریقہ

سوال: کیا کوئی ایسی ترکیب ہے جسے استعمال کر کے تزکیۂ نفس کی منزل کو حاصل کیا جا سکتا اور آفات اور شیطانی وسوسوں سے بچا جا سکتا ہے؟

جواب: میں نے ہمیشہ یہ عرض کیا ہے کہ اس معاملے میں ادھر اُدھر سے ترکیبیں پوچھنے کے بجائے اس راستے پر گامزن رہنا چاہیے جو اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے اور جس پر صحابۂ کرام چلے۔ اس راستے پر چلتے ہوئے نتائج، بے شک جلد نہیں نکلتے، مگر جب نکلتے ہیں تو بڑے محکم اور پائدار ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ان تین باتوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنا لیجیے:

۱۔ قرآنِ مجید کی تلاوت کو روزمرہ کا معمول بنائیے۔

تلاوت سے مراد بے سوچے سمجھے الفاظ کی تکرار کرنا نہیں ہے، بلکہ ہدایت طلبی کے پورے شعور کے ساتھ مطالعہ کرنا ہے۔

۲۔ مسجد کے ساتھ اپنے تعلق کو پوری طرح قائم رکھیے۔

۳۔ ہفتے میں کچھ نہ کچھ وقت نیک لوگوں کی صحبت میں گزاریے۔

یہ تین نکات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ماخوذ ہیں۔ یہی سلوکِ محمدی ہے۔ آپ اگر اس کے علاوہ کوئی دوسرا سلوک یا طریقہ اختیار کریں گے تو اس کا شدید اندیشہ ہے کہ آپ آفات سے بچنے کے بجائے آفات کا شکار ہو جائیں۔ اپنے نفس کو آلایشوں سے پاک کرنے کے بجائے اسے آلودہ کر لیں۔ اللہ کے قرب اور اس کی فرماں برداری کی منزل کو پانے کے بجائے مشرکانہ مشاغل اختیار کر کے اس منزل سے دور ہوتے چلے جائیں اور اپنی دانست میں تزکیۂ نفس کو حاصل کرنے کے باوجود، حقیقت میں اس سے محروم رہیں۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

شادی میں والدین کی رضامندی

سوال: کیا شادی میں والدین کی رضامندی ضروری ہے؟

جواب: قرآنِ مجید نے ہمیں یہ ہدایت دی ہے کہ نکاح معاشرے کے معروف کے مطابق ہونا چاہیے۔ کسی صالح معاشرے کے اندر اس معاملے میں جو ضوابط ہیں، جو روایات ہیں، جو رسوم و رواج ہیں، انھی کے مطابق اس ذمہ داری کو انجام پانا چاہیے۔ ہمارے معاشرے میں اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لیے نہ صرف والدین سرگرم ہوتے ہیں، بلکہ دیگر اعزہ اور احباب بھی اس عمل میں شریک ہوتے ہیں۔ اسی سے رشتوں میں حسن پیدا ہوتا ہے، اسی سے اچھی معاشرت وجود میں آتی ہے اور یہی ہمارا معروف ہے۔

اگر کسی موقع پر والدین اپنے بچوں کی ترجیحات کو یکسر نظر انداز کر دیں اور ناجائز طور پر اپنی مرضی ان پر مسلط کرنا چاہیں تو اس معروف کی خلاف ورزی جائز ہو سکتی ہے، لیکن اس معاملے میں غلط یا صحیح کا تعین کسی معاملے کو سامنے رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی موقع پر والدین کا موقف درست ہو اور کسی موقع پر اولاد کی بات ٹھیک ہو۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس معاملے میں اولاد اور والدین دونوں ہی کو اعتدال کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ نہ والدین کو سختی اور جبر سے کام لینا چاہیے اور نہ اولاد کو نافرمانی اور انحراف کی روش اختیار کرنی چاہیے۔ باہمی موافقت اور محبت سے یہ معاملہ انجام پانا چاہیے۔

وتر کی قضا

سوال: نمازِ وتر اگر چھوٹ جائے تو کیا اس کی قضا پڑھی جائے گی؟

جواب: حنفی نمازِ وتر کو واجب قرار دیتے ہیں، اس لیے ان کے نزدیک وتر اگر چھوٹ جائیں تو ان کی قضا ہو گی۔ میرے نزدیک وتر اصل میں تہجد کی نماز ہے۔ تہجد کی نماز نفل ہے، اس لیے اس کی قضا نہیں ہو گی۔ بعض لوگوں کی کمزوری کے پیشِ نظر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کی نماز کو اس کے اصل وقت سے پہلے پڑھنے کی اجازت دی، اس لیے عام لوگوں نے اسے عشا سے متصل کر کے پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ نماز چونکہ وتر یعنی طاق ہوتی ہے، اس لیے اس کو وتر کہا جانے لگا۔ بہر حال یہ ایک نفل نماز ہے اور نفل نماز کی قضا نہیں ہوتی۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خودکشی میں رضاے الٰہی

سوال: کیا خودکشی کرنے والے کی تقدیر میں یہ بات پہلے سے لکھ دی جاتی ہے کہ وہ خودکشی کرے گا، اور کیا اس میں اللہ کی مرضی بھی شامل ہوتی ہے؟

جواب: خودکشی کے عمل میں اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل نہیں ہوتی، بلکہ اس کا اذن شامل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں آزمایش کے لیے انسانوں کو اس بات کی اجازت دے رکھی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے برائی یا ظلم کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ اجازت نہ دیتے تو آزمایش ناممکن تھی۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے برائی اور بھلائی کا شعور دے کر اس دنیا میں بھیجا ہے اور یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص پر اس کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ اس صورتِ حال میں جب کوئی شخص خودکشی کا اقدام کرتا ہے تو وہ درحقیقت اپنے عمل سے اس بات کا اظہار کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مجھے دنیا میں بھیجنے کا فیصلہ غلط تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک بڑا سنگین جرم ہے، اس میں خدا کی رضا کیسے شامل ہو سکتی ہے؟

آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار

سوال: کیا آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا؟

جواب: یہ بات کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا، امورِ متشابہات میں سے ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب بعض روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ سعادت نصیب ہوگی۔ لیکن یہ سعادت کیسے نصیب ہوگی، اس کا ذکر روایات میں نہیں ملتا۔ احادیث میں جو باتیں درج ہیں وہ یہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی دیکھو گے جیسے کھلے آسمان پر چاند کو دیکھتے ہو۔

اس موقع پر ہماری کیفیت کیا ہوگی؟ ہماری آنکھیں اس نظارے کا کیسے تحمل کر سکیں گی؟ یہ سب باتیں امورِ متشابہات میں شامل ہیں۔ ان کے بارے میں ہمیں اپنے اندازے لگانے کے بجائے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

خضر علیہ السلام

سوال: حضرت خضر علیہ السلام کون تھے؟

جواب: اس بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی کی رائے یہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے۔ اس رائے کا اظہار انھوں نے ''تدبرِ قرآن'' میں سورۂ کہف کی تفسیر میں کیا ہے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی رائے یہ ہے کہ وہ فرشتہ تھے۔ اس معاملے میں، میں اپنے جلیل القدر استاد کی رائے کے بجائے مولانا مودودی صاحب کی رائے کو صحیح سمجھتا ہوں۔ وہ میرے نزدیک کارکنانِ قضا و قدر ہی میں سے تھے۔

قرآن واضح ہے

اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کی رہنمائی کے لیے ہر قسم کی تنبیہات گونا گوں پہلوؤں سے بیان کر دی ہیں، لیکن انسان سب سے زیادہ جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ (الکہف ۱۸: ۵۴)

دنیا کی زندگی میں انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی پہچان اور اپنے وجود کی حقیقت کی دریافت ہے۔ اس کا المیہ یہ ہے کہ وہ محسوسات کے دائرے میں مقید ہو کر بعض اوقات پیش پا افتادہ علمی، اخلاقی اور عقلی حقائق کا انکار کر دیتا ہے۔

دنیا کے موجودات میں ہر چیز کا انکار ممکن ہے، مگر موت ایک ایسی حقیقت ہے جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ انسان اسے ماننے کے باوجود اس سے بے پروا ہو کر زندگی گزارتا ہے۔ وہ روز اپنے بھائی بندوں کو جان دیتے اور اس دنیا سے رخصت ہوتے دیکھتا ہے اور اپنے ہاتھوں سے قبر کے گڑھے میں اتارتا ہے، مگر اس کے باوجود یہ بھول جاتا ہے کہ اسے بھی ایک روز موت کی یہ دہلیز پار کرنا ہے۔

اس آیت میں تنبیہات کے لیے 'مثـــل' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد عالم غیب کے احوال اور آخرت کے حقائق ہیں جنھیں قرآن تمثیل کے پیرایے میں مختلف اسالیب میں پیش کرتا ہے۔ قرآن اسے بتاتا ہے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں، بلکہ ایک دوسری زندگی کا آغاز ہے۔ انسان کو اسی زندگی کی تیاری کے لیے عارضی طور پر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ وہ وقت کے گھوڑے پر سوار تیزی سے اپنی (آخرت کی) منزل کی طرف رواں دواں ہے۔ دنیا میں اس کے قیام کی مثال یوں سمجھ لیجیے کہ جیسے ایک مسافر گاڑی پر سوار ہو، گاڑی کچھ دیر کے لیے کسی اسٹیشن پر رکے اور وہ نیچے اتر کر کچھ دیر کے لیے پلیٹ فارم پر پڑے بینچ پر بیٹھ جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنے سفر سے بے خبر نہیں ہو سکتا، مبادا گاڑی چھوٹ جائے۔ زندگی کا یہ سفر بھی ایسا ہی ہے۔ پہلی صورت میں تو ممکن ہے کہ کچھ انتظار کے بعد دوسری گاڑی مل جائے، مگر زندگی کی

گاڑی اگر چھوٹ گئی تو پھر اس نقصان کے مداوے کا کوئی امکان نہیں۔ دنیا کے پیچھے بھاگنے والے شخص کی مثال ایسی ہی ہے جیسے گاڑی کا کوئی مسافر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پڑے بینچ پر جگہ حاصل کرنے کی تگ ودو میں وہاں پہلے سے بیٹھے مسافروں سے الجھ پڑے اور اسی دوران میں گاڑی چھوٹ جائے۔

قرآن اسے یہی حقیقت یاد دلاتا ہے، مگر وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے بڑا ہی جھگڑالو واقع ہوا ہے۔ وہ قرآن کی ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اسے نظر انداز کرتا ہے اور کوئی نہ کوئی اعتراض کا پہلو ڈھونڈ کر اس سے بچنے کا راستہ نکال لیتا ہے۔

حضرت مسیح نے بھی اس حقیقت کو نہایت خوب صورت تمثیل میں بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ دنیا (اس زندگی اور آخرت کی زندگی کے درمیان میں) ایک پل کے مانند ہے، اس پر گھر نہ بناؤ، اس پر سے گذر جاؤ۔

_____ محمد اسلم نجمی

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

دنیا کی زندگی

اور ان (دنیا کی محبت میں اندھے ہو کر غافل ہو جانے والوں) کو اس دنیوی زندگی کی تمثیل سناؤ کہ اس کو یوں سمجھو کہ بارش ہو جس کو ہم نے آسمان سے اتارا پس زمین کی نباتات اس سے خوب اپجیں پھر وہ چورا ہو جائیں جس کو ہوائیں اڑائے پھریں اور اللہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ (الکہف ۱۸: ۴۵)

اس آیت میں زندگی کی جو تمثیل بیان ہوئی ہے، یہ دنیا کی وہ زندگی ہے جس پر فریفتہ ہو کر انسان خدا اور آخرت کو بھول جاتا ہے۔ یہ آیت نہایت مجمل ہے۔ اس کی تفصیل سورہ حدید میں بیان ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''(یاد رکھو) دنیا کی زندگی میں کھیل کود، آرایش و زیبایش، باہمی تفاخر اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے مسابقت کی تمثیل اس طرح ہے کہ بارش ہو جس کی اپجائی ہوئی نباتات کافروں کے دلوں کو موہ لیں۔ پھر وہ خشک ہو جائے اور تم دیکھو کہ وہ زرد پڑ گئی ہے۔ پھر وہ چورا ہو جائے۔'' (۵۷: ۲۰)

اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ لہو و لعب کی رغبت، زینت و آرایش کا شوق، مال و منال کی کثرت کے لیے بھاگ دوڑ اور معیار زندگی اونچا کرنے کا جنون انسان کو موت اور آخرت سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ یہ چیزیں دنیا کو مزین کر کے اس کی نظروں میں کھبا دیتی ہیں اور اس طرح وہ اپنے مقصد حیات سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ انسان کو گم راہ کرنے کا یہی وہ حربہ ہے جسے شیطان

نے راندۂ درگاہ قرار پا جانے کے بعد ابتدا ہی میں خدا کی بارگاہ میں بیان کر دیا تھا۔قرآن اس صورت واقعہ کو ابلیس کی زبان میں یوں نقل کرتا ہے: ''اس نے (راندۂ درگاہ قرار پا جانے کے بعد) کہا: اے رب، چونکہ تو نے مجھے گم راہ کیا میں زمین میں دنیا کو ان کی نظروں میں کھباؤں گا اور ان میں سے تیرے خاص بندوں کے سوا سب کو گم راہ کر کے چھوڑوں گا۔'' (۱۵:۳۹۔۴۰) گویا دنیا کی آزمایش میں انسان کو ناکام بنانے کے لیے شیطان کا اصل حربہ یہ ہے کہ وہ اسے دنیا کی طمع اور محبت میں اس طرح پھنسا دے کہ وہ آخرت سے بیگانہ ہو جائے۔

یہ بات شیطان کے چیلنج سے بھی واضح ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی بتا دیا ہے کہ وہ کون خوش قسمت ہیں جو اس کی فتنہ سامانیوں سے بچے رہیں گے۔قرآن میں ہے: ''اس (شیطان) کا ان لوگوں پر کوئی زور نہیں چلتا ہے جو ایمان لائے ہوئے ہیں اور اپنے رب پر بھروسا رکھتے ہیں، اس کا زور بس انھی پر چلتا ہے جو اسے دوست رکھتے ہیں اور اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں۔'' (۱۶:۹۹۔۱۰۰)

اس کا مطلب ہے کہ اگرچہ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کو یہ مہلت ضرور ملی ہوئی ہے کہ وہ انسانوں کو بہکائیں اور ورغلائیں، مگر ان کا سارا زور و اختیار ان لوگوں پر چلتا ہے جو آگے بڑھ کر اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے، اسے گلے سے لگاتے اور اللہ کے شریک ٹھہراتے ہیں۔شیطان کا اختیار اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ گمراہی کی دعوت اور ترغیب دے۔اس کے بعد یہ انسان کے ارادے اور مرضی پر منحصر ہے کہ وہ چاہے تو اسے رد کر دے اور چاہے تو قبول کر لے۔ (۱۴:۲۲)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیطان کا اصل ہدف عقیدۂ توحید اور خدا پر توکل ہے۔وہ انھی کو مجروح کرتا اور یہیں سے نقب لگاتا ہے۔بندہ اگر خدا پر غیر متزلزل ایمان رکھے اور ہر حال میں اسی کے فضل اور کارسازی پر بھروسا کرے تو وہ شیطان کے حملوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

——— محمد اسلم نجمی

اخروی زندگی کی حقیقت

بے شک جو شخص اپنے رب کے سامنے مجرم کی حیثیت سے حاضر ہو گا تو اس کے لیے جہنم ہے، نہ اس میں مرے گا اور نہ جیے گا۔اور جو اس کے پاس باایمان ہو کر جائیں گے، انھوں نے نیک عمل بھی کیے ہوں گے، تو یہی لوگ ہیں جن کے لیے اونچے درجے ہوں گے۔ان کے لیے ہمیشگی کے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اور یہ صلہ ہے اس کا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔(طٰہٰ ۲۰: ۷۴۔۷۶)

ان آیات میں آخرت میں حاصل ہونے والی زندگی کی حقیقت بیان ہوئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ جہاں ہمیشہ قائم رہے گا۔ وہاں موت کو بھی موت آجائے گی۔ وہاں دو ہی زندگیاں ہوں گی: خدا کے نافرمانوں، بے پرواؤں اور سرکشوں کو جہنم کی ایسی آگ کے حوالے کر دیا جائے گا جو کبھی سرد نہ ہوگی۔ ان کے عذاب کی شدت کا یہ عالم ہوگا کہ: ''(دوزخیوں میں سے ہر ایک کو) پیپ (ملا) لہو پینے کو ملے گا۔ وہ اس کو گھونٹ گھونٹ کر کے پینے کی کوشش کرے گا اور اس کو حلق سے نہ اتار سکے گا اور موت اس پر ہر جانب سے پلی پڑ رہی ہوگی اور وہ مرنے والا نہ بنے گا اور آگے ایک اور سخت عذاب اس کے لیے موجود ہوگا۔'' (۱۴: ۱۶) قرآن میں دوسری جگہ آیا ہے کہ: ''جن لوگوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا، ہم ان کو ایک سخت آگ میں جھونک دیں گے۔ جب ان کی کھالیں پک جائیں گی، ہم ان کی دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ وہ یہ عذاب کا مزا خوب چکھیں۔'' (۴: ۵۶) ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ہے، انھیں اگر وہ سب کچھ حاصل ہو جائے جو زمین میں ہے اور اس کے ساتھ اس کے برابر اور بھی (مل جائے) تاکہ وہ اس (سارے مال) کو فدیہ میں دے کر روز قیامت کے عذاب سے چھوٹ سکیں تو (ان کی یہ پیش کش رد کر دی جائے گی اور ہرگز) بھی ان کا یہ فدیہ قبول نہ ہوگا۔'' (۵: ۳۶)

اہل جہنم کے لیے عذاب کی شدت، اس کے خلود اور اس کی بے پناہی کی یہی وہ تعبیر ہے جسے 'لا یموت فیھا و لا یحیی' (وہ نہ اس جہنم میں مرے گا اور نہ جیئے گا) کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

ان کے مقابل میں ان خوش قسمت لوگوں کا حال بیان ہوا ہے جو سچے ایمان، اخلاصِ نیت اور عمل صالح کے ساتھ عالم کے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔

'مؤمنا قد عمل الصلحت' کے الفاظ سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایمان وہی معتبر ہے جس کے ساتھ عمل صالح بھی موجود ہو۔ عمل صالح کے بغیر ایمان کی مثال ایسے ٹھونٹھ درخت کی سی ہے جو برگ و بار سے بالکل خالی ہو۔ فطری بات ہے کہ جو درخت اس دنیا میں پھل پھول نہیں لایا، وہ آخرت میں کیسے ثمر بار ہو جائے گا! اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کے ہاں جیسے ایمان کے بغیر اعمال بے وقعت قرار پاتے ہیں، اسی طرح اعمال کے بغیر ایمان بے معنی ہوتا ہے۔ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ بندے سے اعمال صالح کا صدور ہو اور اگر ایسا نہیں ہے تو اسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ حق اور حق پر ثابت قدمی کی نصیحت کو اپنا شب و روز کا وظیفہ بنائے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر یقیناً اس کا عمل صالح نظر ثانی کا متقاضی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو سورۂ عصر میں زمانہ نبوت کو گواہ بنا کر سمجھائی گئی ہے۔

ایسے لوگ جو ایمان اور عمل صالح کا زادِ راہ لے کر آخرت کے سفر پر نکلیں گے، وہ جب موت کی دہلیز پار کر کے ہمیشہ کی

زندگی میں داخل ہوں گے تو وہاں خدا کی رحمت کے فرشتے ان کے استقبال کے لیے موجود ہوں گے۔ یہ خدا کا وعدہ ہے۔ اسے وہ یوں بیان کرتا ہے: ''بے شک ان لوگوں پر جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے (ان کی دل داری کے لیے) فرشتے اتریں گے (اور انھیں اطمینان دلائیں گے کہ آزمایش کا دور ختم ہوا، وہ کامیاب ہوئے اور یہ) کہ اب نہ کوئی اندیشہ کرو اور نہ کوئی غم اور اس جنت کی خوش خبری قبول کرو جس کا (دنیا میں نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے) تم سے وعدہ کیا جاتا (رہا) تھا۔ (اس کے بعد وہ فرشتے کہیں گے کہ کفار نے شیاطینِ جن وانس کے ساتھ دوستی کی اور انھوں نے انھیں جہنم تک پہنچا دیا، مگر تم نے ہمیں دوست بنایا، لہٰذا) ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی رہے (اور جنت کو پانے میں تمھاری مدد کی) اور (اب) آخرت کی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی ہیں۔ اور تم کو اس جنت میں ہر وہ چیز ملے گی جس کو تمھارا دل چاہے گا اور تمھارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کرو گے (یہ جو کچھ تم کو ملے گا، یہ) ربِ غفور ورحیم کی طرف سے ابتدائی ضیافت کے طور پر (عطا ہو گا۔ آگے جو کچھ ملنے والا ہے، اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے)۔'' (۴۱: ۳۰۔۳۲)

اس بحث سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ آخرت کی زندگی دائمی ہے اور یہ ناقابلِ بیان حد تک اذیت ناک اور انتہائی آرام دہ زندگیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب ہے۔ اس میں درمیان کی کوئی راہ موجود نہیں ہے۔

محمد اسلم نجمی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

خدا کا صبر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایذا پہنچانے والی اور تکلیف دہ باتوں کو سن کر ان پر اللہ سے بڑھ کر صبر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ لوگ (مخلوق میں سے کسی کو) اس کا بیٹا قرار دے دیتے ہیں اور (اس کی ذات کو شرک سے آلودہ کر کے گویا اسے بدترین گالی دیتے ہیں، مگر اس کے باوجود) وہ ان (ظالموں) کو عافیت بھی دیتا ہے اور رزق بھی عطا کرتا ہے۔ (مشکوٰۃ، رقم ۲۳)

یہ روایت بندوں کی انتہائی نامناسب، ناپسندیدہ اور مجرمانہ روش کے باوجود اللہ کے کریمانہ رویے کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تاثر بیان کرتی ہے۔

اس حدیث میں دو باتیں بیان ہوئی ہیں:

۱۔ اللہ اپنے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرانے کے عمل کو گالی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے نزدیک شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہے۔ بندہ جب اس کی ذات، صفات یا حقوق میں کسی دوسرے کو شریک ٹھیراتا ہے تو یہ وہ انتہائی اذیت اور تکلیف ہے جو وہ اللہ کو پہنچا سکتا ہے اور بندہ بعض اوقات عالم کے پروردگار کے بارے میں اتنا بے پروا اور سرکش ہو جاتا ہے کہ وہ یہ جرم بھی کر گزرتا ہے۔

۲۔ اللہ کے حلم، صبر اور برداشت کا عالم یہ ہے کہ وہ بندوں کے ایسے انتہائی تکلیف دہ رویوں کے باوجود ان سے درگزر فرماتا ہے اور نہ صرف یہ کہ ان کے جرائم سے صرف نظر کرتا ہے بلکہ وہ انھیں عافیت اور رزق بھی عطا فرماتا ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

''اور اگر اللہ لوگوں سے ان کی حق تلفی پر فوراً مواخذہ کرتا ہوتا تو زمین پر کسی جان دار کو نہ چھوڑتا لیکن وہ ایک وقت معین تک لوگوں کو مہلت دیتا ہے تو جب ان کا وقت معین آ جائے گا تو اس سے نہ وہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکیں گے اور نہ آگے بڑھ سکیں گے۔'' (النحل ۱۶: ۶۱)

قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اگرچہ مشرکانہ رویہ اختیار کر کے اللہ کے سب سے بڑے حق کو بھی تلف کرتا ہے اور خود اپنی جان پر بھی سب سے بڑا ظلم ڈھاتا ہے، لیکن اللہ نے دنیا کے سبھی انسانوں کو مقررہ مدت تک جینے کی مہلت دے رکھی ہے۔ یہ مہلت اس آزمایش کے سبب سے ہے جو اسے دنیا کی زندگی میں درپیش ہے۔ اس آزمایش کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ بندوں کو ان کے کفر و شرک اور نافرمانیوں کے باوجود مقررہ مدت تک زندہ رکھے اور اس طرح انھیں توبہ و اصلاح کی مہلت مل جائے۔ بندہ اگر اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھائے، وہ اپنی غلطی پر متنبہ نہ ہو اور توبہ و انابت کا راستہ اختیار نہ کرے تو پھر جب وقت معین آ جائے گا تو اس کے پیچھے ہٹنے اور آگے بڑھنے کے مواقع ختم ہو جائیں گے۔

اس حدیث سے ہمیں یہ رہنمائی بھی ملتی ہے کہ اختیار و اقتدار کی صورت میں اپنے ماتحتوں اور زیردستوں کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر عفو و درگزر سے کام لینا اور شفقت اور محبت کے ساتھ اصلاح احوال کے لیے کوشاں ہونا خدا کی سنت کی پیروی کرنا ہے۔ بندہ اگر یہ رویہ اختیار کرے تو وہ سراپا خیر اور سید القوم خادمهم (قوم کا سرداران کا خادم ہوتا ہے) کی صحیح تصویر بن جاتا ہے۔

—— محمد اسلم نجمی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حق کی حفاظت

قرآنِ مجید میں برائی کے جواب میں بھلائی کو غیر معمولی نیکی قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''اور بھلائی اور برائی دونوں یکساں نہیں ہیں۔ تم برائی کو اس چیز سے دفع کرو جو زیادہ بہتر ہے تو تم دیکھو گے کہ وہی جس کے اور تمھارے درمیان عداوت ہے، گویا وہ ایک سرگرم دوست بن گیا ہے۔ اور یہ دانش نہیں ملتی مگر انھی کو جو ثابت قدم رہنے والے ہوتے ہیں اور یہ حکمت نہیں عطا ہوتی مگر انھی کو جو بڑے نصیبہ ور ہیں۔''

(حٰمٓ السجدہ ۴۱: ۳۴۔ ۳۵)

یہ تعلیم غیر معمولی اجر کی ضمانت دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر عمل بہت مشکل ہے۔ اس مشکل کے کئی سبب ہیں۔ ایک سبب یہ ہے کہ جب ہمارے خلاف برائی ہوتی ہے تو ہمارے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ ہماری طبیعت میں اشتعال پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس اشتعال پر قابو پانا اور پھر صحیح الفاظ اور مناسب اسلوب میں بات چیت کو جاری رکھنا یا اپنے آپ کو کسی اقدام سے روکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ بالعموم یہ برائی نیکی کے جواب میں ہوتی ہے۔ آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ احسان ناشناسی ہے۔ اور اس طرح کے آدمی کو سبق سکھانا ضروری ہے۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ ہمارے ہاں نرمی کے رویے کو فرد کی کمزوری پر محمول کیا جاتا ہے۔ اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر برائی کے جواب میں اچھائی کا رویہ اختیار کیا گیا تو دوسرا اس سے ناجائز فائدہ اٹھائے گا۔ چوتھا سبب یہ ہے برائی کے باعث ہمارے وقار کو دھچکا لگتا اور ہماری حیثیتِ عرفی مجروح ہوتی ہے۔ وقار کے معاملے میں ہماری دفاعی حس زیادہ فعال ہو جاتی ہے۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے اسباب ہیں جن کے تحت ہم برائی کے جواب میں برائی کا رویہ اختیار کرتے اور اپنے اس عمل پر اپنے ضمیر کی خلش کو دور کرنے کے لیے اسی نوع کے استدلال کا سہارا لیتے ہیں۔

برائی کے بدلے میں نیکی کا آغاز عفو و درگزر سے ہوتا ہے اور آدمی پھر آگے بڑھ کر اچھے سلوک کا اظہار کرتا ہے۔ اس رویے کو اختیار کرنے کے لیے اپنے اندر ایک وصف پیدا کرنا ضروری ہے اور وہ ضبطِ نفس اور نیکی پر استقلال کا وصف ہے۔ اسی وصف کو قرآنِ مجید کی اس آیت میں 'صبر' کے لفظ میں بیان کیا گیا ہے۔ صبر ایک مثبت رویے کا نام ہے جس میں آدمی اپنے جذبات کو قابو میں رکھتا اور اپنے آپ کو منفی اقدام سے روک لیتا ہے۔ اس منزل کو طے کر لینے کے بعد ہی آدمی کے لیے یہ ممکن

ہوتا ہے کہ وہ برائی کے جواب میں نیکی کرے اور قرآنِ مجید کے الفاظ 'ذو حظ عظیم' کا مستحق قرار پائے۔

ہمارا معاشرہ، خاندان، محلے، اور ملک کی سطح پر انتشار اور خلفشار کا شکار ہے۔ اس خلفشار کے بہت سے اسباب میں سے ایک معاشرے کے افراد کی بڑی اکثریت کا صبر کی مذکورہ خوبی سے محروم ہونا ہے۔ معاملہ گھروں کے جھگڑوں کا ہو یا مذہبی یا سیاسی اختلافات کا ہر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کے لیے آمادہ نظر آتا ہے۔ درآنحالیکہ قرآنِ مجید نے واضح کر دیا ہے کہ اتحاد، اتفاق اور دوستی کا راستہ برائی کے جواب میں نیکی ہے۔

——— طالب محسن

اخلاقی اقدار

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کسی نے پوچھا: اخلاقی اقدار کی بنیاد کیا ہے۔ دانش وروں نے جواب دیا: اخلاقی اقدار کی بنیاد سماجی ڈھانچے پر ہے اور سماجی ڈھانچے کے بہت سے عناصر طرزِ معیشت سے براہِ راست متعلق ہوتے ہیں۔ اپنی بات کی تفصیل کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ چوری ایک جرم ہے۔ لیکن اس کا تصور اس وقت سامنے آیا جب چیزوں کو ذاتی ملکیت کی حیثیت حاصل ہوئی۔ عورت کے حقوق جاگیردارانہ معاشرے میں اور ہیں اور موجودہ صنعتی معاشرے میں اور۔ بہت سی اخلاقی اقدار مفادات کے تحفظ کے لیے رائج کی گئیں۔ مثلاً وفاداری اور نمک حلالی کی اقدار کو رائج کر کے نوابوں، جاگیرداروں اور بادشاہوں نے اپنی رعایا کو اپنے استحصالی نظام میں جکڑے رکھا۔ اس تجزیے سے وہ ایک دلچسپ نتیجہ بھی نکالتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر معیشت کے نظام کو نئے خطوط پر استوار کر دیا جائے تو چند ہی برسوں میں بہت سی اقدار دم توڑ دیں گی اور انسانی ضمیر نئے پیمانوں سے اپنا فریضۂ ملامت انجام دے گا۔ ان کی سب سے زیادہ دل چسپی عورت کی آزادی سے ہے۔ ان کے نزدیک اگر مرد اور عورت کو کمائی کے یکساں مواقع میسر ہوں تو عورت مرد کے چنگل سے نکل جائے گی۔ بیوی کا روایتی تصور ختم ہو جائے گا اور مرد و عورت کے حقوق و اختیارات بالکل یکساں ہو جائیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی اقدار کے بارے میں یہ نقطۂ نظر بڑا سطحی ہے۔ یہ اہلِ مذہب کی اس رائے کو باطل کرنے کی کوشش ہے کہ اخلاقی اقدار ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ اہلِ مذہب کا استدلال یہ ہے کہ ان اقدار کا ماخذ وہ فطرت ہے جس پر

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ یہ فطرت ہمیشہ سے ایک ہے اور ایک ہی رہے گی۔ بعض برے عوامل اور حالات اسے غیر مؤثر یا معطل ضرور کر دیتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت کی اپنی کوئی اصل صورت نہیں ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

اس معاملے میں غلطی لگنے کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اخلاقی اقدار کے پیچھے کار فرما اصولوں اور ان کی عملی صورتوں کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ ان دونوں میں بہت فرق ہے۔ مثلاً، دیکھیے، مہمان نوازی ہر معاشرے کی قدر ہے۔ لیکن اس کے اظہار کے طریقے ہر ماحول میں مختلف ہیں۔ مہمان کا دروازے میں آ کر استقبال کیا جائے یا نہیں، اس سے مصافحہ ہو گا یا معانقہ، کھانا پُرتکلف ہو گا یا سادہ، کھانا کھلاتے ہوئے اصرار کیا جائے گا یا محض پیش کر دینا ہی کافی ہے۔ رخصت کرتے ہوئے دروازے تک رخصت کیا جائے گا یا نشست ہی سے، یہ سب امور مختلف ہو سکتے ہیں۔ کہیں ایک امر کو مہمان نوازی کا تقاضا سمجھا جائے گا اور کہیں دوسرے کو، لیکن ان سب اعمال کے پیچھے کار فرما ایک ہی قدر یعنی مہمان نوازی ہے۔

اگر تمام معاشرتی اقدار کو کسی ایک لڑی میں پرونا چاہیں تو وہ خیر خواہی ہے۔ اسی خیر خواہی کے مظاہر عدل، محبت، سخاوت، مساوات، آزادی کے الفاظ کا روپ دھارتے ہیں۔ یہ مظاہر بھی ایک حد تک ہر معاشرے میں یکساں ہیں، لیکن ان کے اطلاق کی صورتیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ یہ چیز اس دھوکے کا باعث بنتی ہے کہ اقدار ایک تغیر پزیر معاشرتی معاملہ ہے۔

تمام اخلاقی اقدار میں اصل اصول کی حیثیت ایک دوسرے کی خیر خواہی کو حاصل ہے۔ یہی حقیقت ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'الدین النصیحة' کے لافانی الفاظ میں بیان کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں یہ بھی واضح فرما دیا کہ اس خیر خواہی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ انسان کی اپنی ذات سے لے کر معاشرے، حکومت یہاں تک کہ دین اور خدا کے لیے بھی مطلوب ہے۔

—— طالب محسن

اندازِ گفتگو

بات کرنے کے کئی اسلوب ہوتے ہیں۔ اچھے انداز میں بات کی جائے تو دل پر اثر کرتی ہے اور اس سے مثبت نتیجہ نکلتا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہے اور اگر برے طریقے سے وہی بات کی گئی ہو تو نفرت پیدا کرتی ہے اور اس سے برا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ الفاظ کا انتخاب اور آواز کا اتار چڑھاؤ بھی بات کو اچھا یا برا بنا دیتے ہیں۔

کسی کو غلط کام پر ٹوکنا ہو تو کہا جا سکتا ہے: ''شرم سے ڈوب مر'' یا اسے یوں احساس دلایا جا سکتا ہے: ''آپ کو اپنے عمل پر ندامت محسوس کرنی چاہیے''۔ پہلے اسلوب میں فائدے کی امید نہیں رکھنی چاہیے، جبکہ دوسری طرح بات کر کے اصلاح کی توقع کی جا سکتی ہے۔ کسی کے والد کا ذکر کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے ''تمھارے باپ نے یوں کیا'' یا ''آپ کے والد صاحب کا طرزِ عمل اس طرح ہے''۔ پہلی صورت میں سننے والا غصے میں آ جائے گا اور بات پر دھیان نہ دے گا، جبکہ دوسری طرح وہ بات سننے اور سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ دوسرے کو فضول خرچی سے روکنا ہو تو ایک انداز ہو گا: ''یوں گل چھرے نہ اڑاؤ''۔ دوسرا اسلوب یوں ہو گا: ''اپنا ہاتھ روک کر خرچ کرو''۔ دونوں طرح اثر مختلف ہو گا۔

یہ چند مثالیں ہیں۔ ہر بات اس طرح کی جا سکتی ہے کہ سننے والا ہمدردی محسوس کر کے تعاون پر آمادہ ہو جائے یا یوں کہی جا سکتی ہے کہ وہ غصے اور ضد میں آ جائے اور مان کر نہ دے۔ اندازِ گفتگو دل نشیں اور اپنی طرف جذب کرنے والا بھی ہو سکتا ہے اور مشتعل کرنے والا اور غصہ دلانے والا بھی۔ آنکھیں نکال کر، تیوری چڑھا کر بولیں تو سامع بات سننے پر بھی آمادہ نہ ہو گا اور اگر نرمی اور محبت سے بولا جائے تو شیطان بھی کان لگا کر سننے لگے گا۔ آواز کے زیر و بم کا بھی یہی حال ہے۔ آواز دھیمی ہو تو اثر رکھتی ہے اور اگر اونچی ہو جائے تو منفی ردعمل کو جنم دیتی ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ حٰم السجدہ میں ارشادِ خداوندی ہے: ''تم (برائی اور سخت کلامی کا) دفاع اس چیز سے کرو جو زیادہ بہتر ہے (یعنی نیکی اور اچھی گفتگو)۔ تب تم دیکھو گے کہ وہی جس کے اور تمھارے مابین عداوت تھی، گویا کہ وہ ایک سرگرم دوست ہے''۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف کفار اور مشرکین آپ کی نرم اور مشفقانہ گفتگو سے متاثر ہوتے اور اسلام قبول کر لیتے۔ اس طرح کئی کٹر دشمن آپ کے جان نثار ساتھی بن گئے۔ سورۂ لقمٰن میں حضرت لقمان علیہ السلام کی اپنے بیٹے کو کی گئی یہ نصیحت بیان ہوئی ہے: ''(اے بیٹے) اپنی آواز کو پست رکھو۔ بے شک سب سے زیادہ بری آواز گدھے کی آواز ہے''۔

آواز میں کرختگی کی بجائے نرمی اور کھردرے پن کی جگہ ملائمت ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ضرورت اور موقع و محل کے مطابق آواز اونچی نیچی کرنے کی صلاحیت دی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ گدھے کی طرح حلق پھاڑ کر لوگوں کے کان کھائے۔ وہ چاہے تو نرم اور خوش کن آواز سے لوگوں کے دل موہ لے یا بھدی آواز نکال کر انھیں اپنے آپ سے متنفر کر لے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ارشاد ہوا تو ان سے نرمی اور ادب سے گفتگو کرنے پر خاص طور پر زور دیا گیا۔ ان کو جھڑکنے حتیٰ کہ اف تک کہنے سے منع کر دیا گیا۔

آدمی کی تمیز اور شرافت سب سے پہلے گفتگو میں جھلکتی ہے پھر دوسرے اعمال میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ آواز کنٹرول

میں رکھنا، ملائمت سے خطاب کرنا اور دل نشین اسلوب اختیار کرنا بڑے دھیان کا تقاضا کرتے ہیں۔ اگر ہر لمحہ احتیاط ملحوظ ہو اور ہمہ وقت خوفِ الٰہی دل پر چھایا ہو، تبھی ایک شخص کے لیے ممکن ہوسکتا ہے کہ اس کی گفتگو سے کسی کو رنج و آزار نہ ہو، بلکہ ایسے متقی کی بات دوسروں کے لیے راحت کا سامان بن جاتی ہے۔

________وسیم اختر مفتی

مغرب کا اخلاقی بگاڑ اور مسلمانوں کی ذمہ داری

مغربی تہذیب جس اخلاقی بگاڑ اور مادر پدر جنسی آزادی کے دور سے گزر رہی ہے، اس پر ہماری طرف سے کافی اعتراضات کیے جا چکے ہیں اور اسے مغربی زندگی کا ایک بڑا منفی پہلو خیال کیا جاتا ہے۔ تاہم اہل مغرب اپنے اس رویے کو معیوب خیال نہیں کرتے۔ وہ اسے آزادی عمل کی غیر متنازع اور مسلمہ انسانی قدر کا لازمی نتیجہ خیال کرتے ہیں۔

مغربی فکر کے ارتقا سے واقف لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ کے دور میں جو ردعمل مروجہ عیسائی مذہب کے خلاف ہوا، وہ بڑھتا ہوا انکارِ مذہب تک جا پہنچا۔ دریافت و ایجاد کے جوش میں فکر وعمل کی جو راہیں کھلیں، انھوں نے ہر پہلو سے مذہب کو ایک کونے میں کر دیا۔ اس صورتِ حال کے متعدد اسباب تھے۔ ان میں پاپائیت کی بے لوچ حکومت کے خلاف ردِعمل، مذہبی عقائد و مسلمات کا جدید سائنسی انکشافات کے خلاف ہونا اور اہل کلیسا کا اپنے توہمات پر اڑ جانا نمایاں تھے۔ مثلاً مسیحی فکر میں زمین کو کائنات کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی، کیونکہ یہ ان کے خدا کی جنم بھومی تھی۔ جبکہ سائنس کے نزدیک یہ بات خلافِ واقعہ تھی، لیکن انھوں نے اس حقیقت کو ماننے کے بجائے سختی سے جدید خیالات کو دبانے کی کوشش شروع کر دی جس کے نتیجے میں مذہب کے خلاف جذبات پیدا ہونا شروع ہو گئے۔

انیسویں صدی تک مغربی فکر کے لیے نظریاتی طور پر بھی خدا کو ساتھ لے کر چلنا مشکل ہو گیا۔ مگر رکاوٹ یہ تھی کہ انسان ایک توجیہ پسند مخلوق ہے۔ انکارِ خدا کے بعد لازمی تھا کہ خدا کے بغیر انسان اور کائنات کی توجیہ کی جائے اور ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کے لیے یہ بتانا ضروری تھا کہ بغیر ایک خالق کے کائنات اور انسان کیسے وجود میں آئے۔ قرآن بھی اپنے منکرین کے سامنے یہی دو سوال رکھتا ہے: ''کیا یہ بغیر کسی (پیدا کرنے والے) کے پیدا ہو گئے یا یہ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ کیا انھوں نے ہی آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے؟ بلکہ یہ یقین نہ کرنے والے لوگ ہیں'' (الطّور ۵۲: ۳۵-۳۶)

کائنات کا مسئلہ تو خیر آج کے دن تک حل نہیں ہو سکا، بلکہ الٹا Big Bang Theory نے اب اس بات کا پورا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

امکان سائنسی بنیادوں پر ثابت کر دیا ہے کہ کائنات کا آغاز جس دھماکے سے ہوا، وہ ایک خالق کی بیرونی مداخلت کے نتیجے میں ظہور پزیر ہوا۔ البتہ اس زمانے میں ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی صورت میں خدا کے بغیر انسان کی توجیہ کی ایک شکل لوگوں کے سامنے آ گئی۔ گویا بندر کے ہاتھ ناریل لگ گیا (نظریۂ ارتقا میں بندر اور انسان میں جو خصوصی تعلق ہے، یہ محاورہ پڑھتے ہوئے، وہ ذہن میں حاضر رہے)۔ حال یہ ہوا کہ ڈارون کو The Man Who Killed the God کا خطاب مل گیا۔ نظریۂ ارتقا کی غیر مقبولیت کا سبب، اس کی تمام تر عملی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود یہی تھا کہ اس نے سائنسی بنیادوں پر خدا سے ہٹ کر انسان اور حیات کی توجیہ کرنے کی کوشش کی۔

پھر کیا تھا سماجی، عمرانی، نفسیاتی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور تاریخی علوم کے ماہرین کی ایک فوج انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر اس اصول کی روشنی میں کام کرنے کے لیے کھڑی ہوگئی کہ انسان ایک بے خدا اور حیوانی الاصل ہستی ہے۔ ان علوم میں سے دو ایسے تھے جن سے موجودہ جنسی بے راہ روی کی فضا ہموار ہوئی۔ پہلا علم نفسیات کا تھا۔ فرائڈ نے اس پر کام کیا اور جنس کے جذبے کو بنیاد بنا کر تمام انسانی اعمال و اعتقادات کی تشریح کر ڈالی اور اسی بنیادی جبلت (Basic Instinct) کو زندگی کی روح رواں قرار دیا۔

اس سے کہیں زیادہ اثر اس کام کا ہوا جو انسانی تہذیب پر کیا گیا۔ اس میں دکھایا گیا کہ جنسی اخلاقیات کا ماخذ فطرت یا مذہب نہیں، بلکہ معاشی نظام ہے جو شکار سے زراعت اور زراعت سے صنعت تک پہنچا ہے۔ اس علم کے مرتبین نے یہ بتایا کہ انسانی معاشروں میں ابتداءً مرد وعورت کے تعلقات مکمل جنسی آزادی کے اصول پر قائم تھے، مگر جب انسان نے شکار سے زراعت کے عہد میں قدم رکھا تو زمین کی انفرادی ملکیت کا نظریہ پیدا ہوا۔ ایک مرد کو زمین پر کام کرنے کے لیے کام کرنے والوں کی ضرورت پڑی۔ ان کارکنوں کے حصول کا بہترین ذریعہ اولاد تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ شادی کا سلسلہ شروع ہو جس میں کسی عورت کی وفاداریاں صرف ایک مرد سے وابستہ ہوں اور اس سے ہونے والی اولاد صرف اسی کی ملکیت ہو۔ عورت کے ایک مرد کی ملکیت ہونے کے اسی تصور سے عصمت اور حیا کے تصورات پیدا ہوئے تاکہ ان پابندیوں سے عورتوں کی لگام ہمیشہ مردوں کے ہاتھ میں رہے۔ جبکہ مردوں نے خود کو ہمیشہ ان زنجیروں سے آزاد رکھا ہے۔

اس تحقیق کے مطابق اب انسان نے زراعتی دور سے صنعتی دور میں قدم رکھ دیا ہے۔ پیداواری عمل میں نہ صرف انسانوں کی اہمیت کم ہوگئی ہے، بلکہ عورت خود معاشی طور پر مکمل آزاد ہے۔ لہٰذا اب نہ کسی عورت کے ایک مرد سے جڑے رہنے کی کوئی ضرورت ہے، نہ شادی کی، نہ عصمت کوئی قابل لحاظ شے ہے نہ حیا کی کوئی ضرورت ہے۔ نتیجے کے طور پر خاندان کے بنیادی ادارے کی ساری اساسات ختم ہوگئیں۔

اس پس منظر کو اگر آپ ذہن میں رکھیں تو آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ کیوں اہل مغرب بغیر شادیوں کے ساتھ رہتے ہیں، کیوں خاندان کا ادارہ کمزور ہو چکا ہے، کیوں وہ شادی کے بعد بھی دیر سے اور کم بچے پیدا کرتے ہیں، کیوں عورتیں گھر سے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

باہر نکل آنا ضروری سمجھتی ہیں؟

ہمارے مسلم معاشرے بھی بد قسمتی سے اسی راہ پر چل پڑے ہیں جو اہل مغرب کا راستہ ہے۔ ایک طرف ہمارے معاشرے صنعتی دور میں داخل ہو چکے ہیں جس کے اپنے تقاضے اور نتائج و اثرات ہیں۔ دوسری طرف سیٹلائٹ، کیبل اور انٹرنیٹ کے ذریعے سے مغربی افکار اور اخلاقی بگاڑ ہمارے گھروں میں داخل ہو کر لوگوں کے ذہنوں کو مسموم کر رہے ہیں۔ تیسری طرف ہماری پڑوسی ہندو تہذیب مغرب کے سامنے سجدہ ریز ہونے کے بعد اس کا بگاڑ ہماری زبان میں بالخصوص ہماری عورتوں تک پہنچا رہی ہے۔ ان سب کے ساتھ ہماری اشرافیہ اور حکمران طبقہ اوپر بیان کردہ مغربی افکار کے پروردہ ہیں اور اس فکر کو دن رات عوام میں روشن خیالی اور خواتین کے حقوق کے نام پر پھیلانے کے لیے کوشاں ہیں۔

ہمارے معاشرے میں کس طرح خاموشی سے تبدیلی آ رہی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں پردہ و حجاب کی قدر اب محض ایک اقلیت کا جامہ بن کر رہ گئی ہے۔

ان حالات میں اہل مغرب کی جنسی بے راہ روی پر شور مچانے سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ ان تمام مغربی افکار و تحقیقات پر قرآن کی روشنی میں تنقید کی جائے جو اس اخلاقی بگاڑ کو جواز فراہم کرتی ہیں۔ یہ کام مسلمان اہل علم کے کرنے کا ہے۔ اگر انھوں نے یہ کام بروقت نہ کیا تو اندیشہ ہے کہ مغربی تہذیب کا یہ طوفان ہماری مذہبی اور معاشرتی اقدار کو ساتھ بہا کر لے جائے گا۔ اس کے ساتھ ایک بہت اہم کرنے کا کام یہ بھی ہے کہ فکر آخرت کے تصور کو عام کیا جائے، کیونکہ مغربی تہذیب کے زہر کا حقیقی تریاق اگر کوئی ہے تو یہی ہے۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ـــــــــ ریحان احمد یوسفی

فرقہ پرستی اور اس کا علاج

اللہ تعالیٰ نے انسان کو متنوع اور رنگا رنگ صلاحیتوں، ذہانتوں اور مزاجوں سے نوازا ہے۔ اپنے گھر میں اپنے احباب میں اور اپنے معاشرے میں جب وہ انھیں بروئے کار لاتا ہے تو اس سے آرا کا اختلاف جنم لیتا ہے۔ جب کسی خاص مسئلے پر ہمارے سامنے کوئی مختلف رائے آتی ہے تو وہ ہمیں کئی پہلوؤں سے غور کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے، اس کی گرہیں کھولنے میں مدد دیتی ہیں اور بالآخر ہم اس مسئلے کا حل دریافت کر لیتے ہیں۔ گویا اختلاف رائے ایک نعمت ہے جو ہمارے فکر و عمل کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ نعمت اگر میسر نہ ہو تو اندھی تقلید پیدا ہوتی ہے جو اندھی عقیدت سے جنم لیتی ہے اور اسی سے

فرقہ پرستی کا آغاز ہوتا ہے، ہم اگر صحابہ کی زندگی کا مطالعہ کریں تو اختلاف رائے کی کئی مثالیں ہمارے سامنے آئیں گی۔ صحابۂ کرام آزادانہ ایک دوسرے کی علمی و عملی آرا پر تنقید کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے ان کے درمیان کبھی محبت میں کمی نہیں آئی، بلکہ اس کے برعکس جب بھی ان میں سے کسی کو غلطی کا احساس ہوا تو اس نے فوراً اپنی رائے تبدیل کر لی۔ حضرت عثمان حج میں نمازیں قصر نہیں کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کو پتا چلا تو انھوں نے فرمایا کہ ان کی رائے درست نہیں ہے، مگر چونکہ وہ خلیفہ ہیں تو انھی کی رائے پر عمل ہوگا۔ یہی طرزِ عمل تابعین اور فقہا کے ہاں بھی پوری شان سے نظر آتا ہے۔ یہ حضرات نہ صرف غلطی معلوم ہونے پر اپنی آرا بھی تبدیل کرتے تھے، بلکہ ایک دوسرے کی رائے کا احترام بھی کرتے تھے۔ ایک تابعی یحییٰ بن یزید نوفلی نے امام مالک کو یہ لکھا:

’’میں نے سنا ہے کہ تم باریک (نفیس) کپڑے پہنتے ہو اور پتلی پتلی چپاتیاں کھاتے ہو اور نرم بچھونے پر بیٹھتے ہو اور اپنے دروازے پر دربان مقرر کرتے ہو، حالانکہ تمھاری مجلس علم کے لیے ہوتی ہے جس میں لوگ دور و نزدیک سے آتے ہیں۔ جنھوں نے تمھیں اپنا امام بنا رکھا ہے اور تمھارے اقوال پر راضی ہیں۔ تمھیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا چاہیے اور تواضع کو لازماً اختیار کرنا چاہیے۔ میں نے یہ خط تمھیں بطور نصیحت لکھا ہے جسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔‘‘

آخری فقرے پر غور کیجیے اور پھر امام مالک کا جواب ملاحظہ فرمائیے:

آپ کا نوازش نامہ ملا۔ میں آپ کی شفقت اور نصیحت کا شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تقویٰ کی نعمت سے نوازے اور اس نصیحت کے عوض بھلائی دے۔ میں گناہوں سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی توفیق چاہتا ہوں۔ آپ نے یہ جو لکھا ہے کہ میں باریک کپڑے پہنتا ہوں، پتلی چپاتیاں کھاتا ہوں، نرم فرش پر بیٹھتا ہوں اور دروازے پر دربان رکھتا ہوں تو واقعی میں ایسا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی کا خواستگار ہوں، مگر باری تعالیٰ یہ بھی تو فرماتے ہیں: قل من حرم زینت اللّٰہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق۔ یہ میں جانتا ہوں کہ ان چیزوں کا ترک کر دینا، ان کو اختیار کرنے سے بہتر ہے۔ آپ اپنی خط و کتابت سے ہمیں نہ بھولیے۔ ہم بھی خط و کتابت جاری رکھیں گے۔‘‘

پہلے خط میں خیر خواہی کا رنگ غالب ہے۔ دوسرے خط میں نہ صرف اس جذبے کی قدر دانی ہے، بلکہ اپنا اختلاف بھی مناسب و موزوں انداز میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ یہ ہماری اس علمی روایت کی ایک جھلک ہے جس نے بڑی بڑی قد آور شخصیات پیدا کیں اور پھر وہ عظیم الشان دینی لٹریچر تخلیق ہوا جو آج بھی دین کے طالب علم کے لیے مشعل راہ ہے۔ مگر اسے مسلمانوں کی بدقسمتی ہی کہیے کہ بجائے اس کے کہ ان شخصیات کے کام سے فائدہ اٹھا کر دینی علم کو آگے بڑھایا جاتا اور مسلمان ہر زمانے میں اٹھنے والے سوالات کا مقابلہ کرتے، ان شخصیات سے اندھی عقیدت پیدا ہوئی۔ اس اندھی عقیدت نے بعد میں اندھی تقلید پیدا کی اور آج یہ حال ہے کہ کہیں شیعہ اور سنی میں فساد ہے تو کہیں اہل حدیث اور احناف باہم جھگڑ رہے ہیں۔ پھر ان فرقوں نے ایک خاص قسم کی اجارہ داری بھی قائم کر رکھی ہے کہ یہ کسی اور عالم کو دین پر غور کرنے اور ان کی آرا سے مختلف

رائے رکھنے کی اجازت دینے کو بھی تیار نہیں ہیں۔اس فرقہ پرستی کا انجام ہمارے سامنے ہے۔لوگوں میں مذہب سے دوری اور بیزاری اپنے عروج پر ہے۔لوگ اب کسی بھی فرقے پر اعتماد نہیں کرتے حتیٰ کہ دین کا علم رکھنے والوں کی معاشرے میں کوئی قدر نہیں۔

اس معاملے کو اگر ہم دین کی روشنی میں دیکھیں تو ہمارے سامنے قرآن مجید کا یہ ارشاد آتا ہے:''اور سب اللہ کی رسی کو تھامے رہو اور تفرقے میں نہ پڑو۔''

اللہ کی رسی کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:''یہ قرآن ہے جو آسمان سے زمین تک اللہ کی تانی ہوئی رسی ہے''۔مولانا اصلاحی اس آیت کی شرح میں فرماتے ہیں:

> ''حبل اللہ'' سے مراد قرآن ہے،اس لیے کہ یہی ہمارے رب اور ہمارے درمیان ایک عہد و میثاق ہے۔خدا کو مضبوطی سے پکڑنا ظاہر ہے کہ اپنے ظاہری مفہوم میں نہیں ہے،اس لیے کہ خدا چھونے اور پکڑنے کی چیز نہیں،اس کو مضبوطی سے پکڑنے کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ ہم اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں جو ہمارے اور اس کے درمیان واسطہ ہے۔''

اللہ کا مطالبہ تو ہم سے قرآن تھامنے کا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ پوری امت میں کوئی شخص روایات کی وادی میں گم ہے تو کوئی اپنی مخصوص فقہ کے حصار میں قید ہے اور قرآن جو کہ میزان،فرقان اور حبل اللہ ہے، وہ روایت اور فقہ کے رحم و کرم پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم ایک طرف قرآن کو اپنا ہادی و رہنما نہیں مانیں گے اور دوسری طرف اپنے اوپر تنقید سننے کو گوارا نہیں کریں گے،ہم پر علمی زوال کی یہ کالی رات چھائی رہی گی اور ہم فرقہ پرستی کی دلدل میں پھنسے رہیں گے۔

______ کاشف علی خان شیروانی

---

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محمد بلال

''نئی دنیا (امریکہ) میں صاف باتیں''

تصنیف: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ضخامت: ۱۳۹ صفحات

ناشر: مجلس نشریات اسلام ا۔کے۔۳ ناظم آباد ا۔ کراچی

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.com

''اشراق''، میں دو قسم کی کتابوں پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ ایک وہ جو تبصرے کے لیے ہمارے پاس بھیجی جاتی ہیں اور دوسری وہ جو تبصرے کے لیے ہم خود منتخب کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب ہم نے ایک کتب خانے میں دیکھی، اس کے بعض صفحات کا سرسری مطالعہ کیا اور چند ہی لمحوں بعد اسے علمی اور دعوتی اعتبار سے لفظ بہ لفظ پڑھنے کے قابل پایا۔ اور پھر پڑھتے ہوئے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی اسلام کے پہلو سے بلند سطح سے گفتگو اور انسان کے پہلو سے ان کی دور بینی اور دروں بینی نے اس پر تبصرہ کرنے پر مجبور کر دیا تا کہ اس کتاب کا تعارف وسیع تر ہو اور اس کی دعوتی تاثیر سے اور لوگ بھی سیراب اور بیدار ہوں۔

۱۹۷۷ء میں شمالی امریکا کی مسلم تنظیم ایم ایس اے (Muslim Student Association America and Canada) نے بھارت کے جید عالم دین مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو امریکا اور کینیڈا کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ اس پروگرام کے تحت مولانا نے ان ممالک کے مختلف مقامات میں مختلف موضوعات پر خطاب کیا۔ اس کتاب میں انھی خطبات کو مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔

امریکا کے بارے میں مسلمانوں کے ہاں دو قسم کے رویے پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ امریکا دنیا کا خوش قسمت ترین ملک ہے، جو بدقسمت بھی اس جنت میں پہنچ جاتا ہے، اس کی قسمت کے بند دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ امریکا ایک سازشی ملک ہے۔ وہ اپنے مفادات کی خاطر دوسرے ممالک کے خلاف ہر وقت مختلف قسم کی سازشیں کرتا رہتا ہے۔

مولانا اپنے ان خطبات میں یہ کہتے ہیں کہ بے شک امریکا ایک خوش قسمت ملک ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بدقسمت ملک بھی ہے۔ اسی طرح وہ سازش کے حوالے سے بھی بڑی عجیب بات کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکا کے خلاف ایک بہت بڑی اور بہت خطرناک سازش ہوئی اور یہ سازش کامیاب ہوگئی۔ مولانا کہتے ہیں:

''خوش قسمت اس وجہ سے کہ خدا نے اس کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا، یہاں کے رہنے والوں کو ایسی قوتِ ارادی، ایسا جوشِ عمل، ایسی ذہانت، ایسا کام کرنے کا جذبہ، ایسی توانائی عطا کی کہ اس نے اس زمین کو جنت کا نمونہ بنا دیا، خدا کی قدرت کے رازوں کا انکشاف کیا، کائنات کی قوتوں کو مسخر کیا، اقبال کے الفاظ میں سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا، ستاروں کی گزرگاہوں کو دریافت کیا، اس نے اس مٹی کو سونا بنا دیا، اب یہ زمین سونا اگلتی ہے، یہاں کی فضا سے ہن برستا ہے، اور یہاں (بائیبل کی زبان میں) دودھ اور شہد کے دریا بہتے ہیں، یہ نتیجہ ہے، ان قوموں کے جوشِ عمل کا، ان کے جذبۂ مسابقت کا، ان کی بے چین فطرت کا، اور ان کے نہ تھکنے والے نہ ہارنے والے عزم کا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس خطۂ زمین کو جو یورپ سے یہاں تک پھیلا ہوا ہے، قدرتی دولتوں سے مالا مال کیا، خدا کی نعمتوں کے بہتیرے خزانے یہاں موجود ہیں، اور پھر موجود ہی نہیں، بلکہ یہاں وہ ہاتھ بھی موجود ہیں، جو ان خزانوں کو برآمد کریں اور قدرت کی دولت سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، اس لحاظ سے یہ ملک بڑا خوش قسمت ہے، اور اس نے اپنی خوش قسمتی کا سکہ صرف اس ملک کے رہنے والوں پر نہیں بلکہ ساری دنیا پر بٹھا دیا ہے، آج ساری دنیا ان کی دریوزہ گر ہے، دنیا کی ہر قوم ان کے سامنے جھولی پھیلائے بلکہ ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے، اور بھیک مانگ رہی ہے۔'' (۳۶۔۳۷)

پھر اس ملک کی بدقسمتی واضح کرتے ہیں:

''لیکن اس کے باوجود یہ ملک بدقسمت ہے، یہ الفاظ میں پوری جرأت اور صفائی کے ساتھ کہہ رہا ہوں، بہت سے بھائیوں کے لیے یہ اجنبی اور نامانوس ہوں گے، لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، یہ واقعہ ہے کہ یہ ملک بڑا بدقسمت ہے! اس ملک کی نہیں بلکہ انسانیت کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس ملک نے تنہا مادی میدان میں فتوحات حاصل کیں اور اس میں ریکارڈ قائم کر دیا۔ اس نے اس زمین کو گلزار لالہ زار بنا دیا۔ بڑی خوش قسمتی کی بات ہوتی اور دنیا کی تاریخ کچھ اور ہوتی اگر اس خطۂ زمین کو صحیح رہنمائی حاصل ہوتی اور اس کو دین صحیح کی نعمت ملی ہوتی، اور جس طرح اس نے مادیات کی طرف توجہ کی اخلاقیات کی طرف توجہ کرتا، اور جس طرح اس نے آفاق میں خدا کی نشانیاں دیکھی ہیں، اور 'سنریهم ایاتنا فی الافاق' پر عمل کیا ہے، ویسے ہی 'انفس' خدا کے پیدا کیے ہوئے دل، عطا کی ہوئی روح، اور لطیف احساسات میں بھی خدا کی نشانیاں دیکھتا اور دنیا کو دکھاتا، اس کی ذہانت صرف اس پر مرکوز نہ رہتی کہ وہ قدرت کے رازہائے سربستہ فاش کرے بلکہ وہ اپنے دل اور روح کے اسرار اور انسانی دل کی گہرائیوں سے بھی واقف ہوتا اور اس کو معلوم ہوتا کہ جتنی یہ کائنات وسیع نظر آتی ہے، اور سیاروں کا اس نے جو رقبہ و حجم دریافت کیا، جن جن چیزوں کا اس نے انکشاف کیا اور اب آخر میں چاند پر پہنچ کر ایک اور نئی فتح حاصل کی ہے، اگر اسی تناسب سے یا اس سے بہت کم تناسب سے وہ انسانی روح کی حقیقت کی طرف توجہ کرتا اور اسے خدا کی صحیح

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

معرفت حاصل ہوتی اور انسانی قلب کی وسعت، طاقت، حرارت، محبت اور اس کی لطافت اور معصومیت، بے لوثی اور بے غرضی کو بھی معلوم کرتا، وہ قلب کو بیدار کرنے کی کوشش کرتا اور اس کے اندر کی طاقتوں سے آشنا ہوتا اور ان سے کام لینے کی اس کو توفیق ہوتی، اس وقت اس کو معلوم ہوتا کہ یہ پوری کائنات اگر دل کے اندر ڈال دی جائے تو گم ہو جائے جس طرح ایک حقیر کنکری بحر اوقیانوس میں ڈال دی جائے اور پتا بھی نہ چلے کہ وہ کہاں گئی۔'' (۳۷۔۳۸)

اس کے بعد اس بدقسمتی کا تعلق ایک سازش کے ساتھ کچھ اس طرح قائم کرتے ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ اس ملک کے لیے اس خطۂ زمین کے لیے مناسب ترین مذہب اسلام تھا، جو انسانی قوتوں کو بیدار کرتا ہے، جو عقل انسانی کی ہمت افزائی کرتا ہے، جو عقل سے کام لینا سکھاتا ہے، وہ انسان میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے، اپنی عزت کا احساس پیدا کرتا ہے۔...... [اسلام نے] انسان کا مرتبہ اتنا بڑھایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس سے آگے انسانیت کی بلندی کا تصور نہیں ہو سکتا۔...... اسلام یہ بتاتا ہے، انسان پیدائشی طور پر بے گناہ ہے، اس کی فطرت صالح ہے۔...... اگر اس ملک کا اور اسلام کا سنجوگ ہو جاتا یعنی ایک جائز رشتہ قائم ہو جاتا تو دنیا کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی، ایک طرف اس خطۂ زمین کے لوگوں کی توانائی، ابلتی ہوئی طاقتیں جو جوش مارتی ہیں، جس طرح فوارہ ابلتا ہے، ان کے اندر کام کرنے کی لامحدود طاقت، ان کو کسی چیز پر چین نہیں ہے، یہ سیاروں تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں، سمندر کھنگال کر اس سے موتی نکالنا چاہتے ہیں، سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں، مٹی سے سونا برآمد کرنا چاہتے ہیں، انھوں نے بے جان چیزوں میں جان ڈال دی ہے، ایک طرف ان کی توانائیاں، ان کی بے چین فطرت، ان کے ملک کی شادابی اور قدرتی نعمتیں، دوسری طرف اسلام کی راہِ اعتدال، اسلام کی حوصلہ افزائی، اسلام کا دین فطرت ہونا، اسلام کا اپنے اوپر اعتماد پیدا کرنا کہ انسان اپنی ذات سے بے گناہ ہے، وہ ماں کے پیٹ سے بالکل بے گناہ پیدا ہوتا ہے، اور اگر وہ گناہ کرتا ہے تو وہ ایک عارضی چیز ہوتی ہے جیسے ہی وہ توبہ کا ارادہ کرتا ہے تو وہ زنگ جو اس پر لگ گیا ہے وہ نکل جاتا ہے، توبہ کوئی مجبوری کی چیز نہیں بلکہ وہ عین اس کی فطرت کا تقاضا ہے، اور اندر سے وہ چیز ابھرتی ہے باہر سے نہیں آتی اس لیے توبہ کرنے والوں کا بڑا مقام بتایا گیا ہے، اسلام انسان کی ہمت افزائی کرتا ہے وہ انسانی قوت کو ابھارتا ہے، وہ دین توحید ہے، اس میں کہیں تخیلات پروری نہیں ہے، وہ حقائق پر مبنی ہے، وہ ایسا عام فہم اور بدیہی مذہب ہے، جس کو ہر سلیم الفطرت آسانی سے سمجھ جاتا ہے، وہ انسانی زندگی کو بیڑیاں نہیں پہناتا کہ انسانی زندگی مقید ہو کر رہ جائے وہ علم کی راہ نہیں روکتا بلکہ علم کو ایک مقدس عبادت قرار دیتا ہے، وہ انسان کو دعوتِ فکر و مطالعہ دیتا ہے۔

بدقسمتی ہے، اس ملک نے جس مذہب کا انتخاب کیا وہ اس ملک کو بتاتا ہے کہ انسان پیدائشی طور پر گناہگار ہے، وہ انسان کے اندر ایک قسم کی مایوسی پیدا کرتا ہے کہ گناہ، یہ اس کی قسمت ہے اور قسمت بدل نہیں سکتی، یعنی اس کا یہ جنم کا روگ ہے، وہ جنم کا گناہگار ہے، ایک تو یہ ہوتا ہے کہ اس سے غلطی ہو جائے اور وہ سمجھے غلطی ہوئی اور اس کی وہ تلافی کر دے، لیکن انسان کے اندر یہ عقیدہ بٹھا دیا جائے کہ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیسا احساسِ کمتری پیدا ہوگا۔

تو ایک تو اس ملک کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس نے جس مذہب کا انتخاب کیا وہ مذہب اس کی انسانیت کا شرف نہیں بڑھاتا بلکہ

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس کی انسانیت پر دھبا لگاتا ہے، اور اس کو داغ دار بنا کر پیش کرتا ہے،......اور اس کو باور کراتا ہے کہ اس کو ایک ایسی ہستی کی ضرورت ہے جو اس کا کفارہ بن کر اس کے گناہوں کو معاف کروائے، غضب یہ ہوا کہ پھر تھوڑے ہی عرصہ بعد اس میں رہبانیت اور ترکِ دنیا کا رجحان پیدا ہوگیا۔

دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ جب کلیسا صاحبِ اقتدار تھا تو کلیسا نے علم وعقل کی راہ روکی، جب یورپ بیدار ہو رہا تھا اور وہ زنجیریں توڑ رہا تھا، جو اس کے پاؤں میں ڈال دی گئی تھیں تو کلیسا ایک دیوار بن کر کھڑا ہوگیا، اس نے ہر چیز کو اپنے فیتے سے ناپنا شروع کیا اور ہر چیز کی سند بائیبل سے تلاش کرنا شروع کی، اس نے زمین کی کرویت کا خیال پیش کیا تو کلیسا نے اس کی مخالفت کی، اس نے تعددِ عوالم کا نظریہ پیش کیا کہ یہی دنیا بلکہ اور دنیائیں بھی ہیں تو کلیسا نے اس کو کفر قرار دیا، ارتداد قرار دیا، اس نے بتایا کہ زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہے تو کلیسا نے کفر کا فتویٰ لگایا۔ پھر کلیسا نے احتساب کی عدالتیں (Inquisitions) قائم کیں جو لوگ اس کا نشانہ بنے ان کی تعداد گزشتہ جنگِ عظیم کے مقتولین کی تعداد سے کسی طرح کم نہیں ہے، یہ دو چیزیں ایسی جمع ہوگئیں جن سے اس ملک کا رخ یکسر مادیات کی طرف ہوگیا، اس کے اندر ایک مذہب سے نہیں بلکہ مطلق مذہب کی طرف سے بے اعتمادی اور ایک طرح کا کینہ اور انتقامی جذبہ پیدا ہوگیا، اس نے یہ سمجھا کہ علم میں اس وقت تک ترقی نہیں ہوسکتی، جب تک مذہب کی بیڑی کو کاٹ کر پھینکا نہ جائے اور کلیسا سے آزادی حاصل نہ کرلی جائے، چنانچہ اس نے کلیسا سے بغاوت کی اور اس کے بعد اس نے یہ مادی سفر شروع کیا جس کے نتائج آج آپ کے سامنے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

عیسائیت صدیوں پہلے جب وہ فلسطین کی سرزمین سے نکلی تھی، اور اس نے رومن امپائر میں قدم رکھا تھا، اسی وقت سے اس نے اپنی شخصیت کھودی، مجھے بڑی خوشی ہے کہ عیسائیت کے سب سے بڑے مرکز میں مجھے یہ کہنے کی جرأت ہو رہی ہے کہ موجودہ عیسائیت اس نبی مبعوث کا مذہب نہیں جو اللہ کا پیغام لے کر آیا تھا، اور امن ومحبت کا پیغام دیتا تھا، بلکہ موجودہ عیسائیت سینٹ پال کی پیدا کی ہوئی ہے، یہ اس کی ذہانت کا نتیجہ ہے، یہ سینٹ پال اور قرونِ وسطیٰ کی مسیحیت ہے، مسیحیت ایسے ابلتے ہوئے دوڑتے ہوئے ملک اور بے چین و بے تاب تہذیب اور نسل کی رہنمائی کرنے سے قاصر ہے، نہ اس میں جامعیت کا پیغام ہے، اور نہ اس میں وہ اخلاق کی طاقت ہے، جو اس کو روک سکے۔''

(۴۰۔۴۱۔۴۲۔۴۳۔۴۴۔۴۵۔۶۲۔۶۳)

اس حقیقت کو بے نقاب کرنے کے بعد مولانا روایتی قومی سوچ کے حامل مسلمانوں کی طرح امریکا کی بدقسمتی پر خوش نہیں ہوتے، اس لیے کہ وہ جانتے ہیں کہ سچا مسلمان دوسروں کے لیے سراپا دعوت اور سراپا خیر ہوتا ہے، وہ دوسروں کو نفع پہنچانے یا کسی نقصان سے بچانے کے لیے ہر وقت بے تاب ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''جس وقت ترکوں کو اقتدار حاصل ہوا تھا، اور مغرب میں ان کی مضبوط حکومت قائم ہوئی تھی یا اس سے بھی قبل جب اسپین میں مسلمانوں کی حکومت قائم تھی، اس وقت یورپ میں اسلام کی اشاعت ہوتی تو مغرب آج اس ورطہ میں نہ پڑتا، اس مادیت کے دلدل میں نہ پھنستا اور نہ اس کی وجہ سے وہ قومیں ان دلدلوں میں پھنستیں جو یورپ کی مقلد ہیں۔......لیکن

افسوس کہ ہم نے اس وقت سے کام نہ لیا، اس سے بھی پہلے جب اسلام کے داعی دنیا میں نکلے تھے، کاش کہ اس وقت وہ داعی یہاں پہنچ جاتے، کہا جاتا ہے کہ امریکا کا کولمبس سے پہلے مسلمانوں نے انکشاف کیا تھا کاش وہ اس انکشاف سے فائدہ اٹھاتے اور اس ملک کو ایک پیغام دیتے اور وہ پیغام اسلام ہوتا۔...... اس وقت یہ تمدن پوری طرح خودکشی کرنے کے لیے تیار ہے، اور اس گہری خندق میں چھلانگ لگانے کے لیے تیار ہے، جس میں گرنے کے بعد کبھی ابھر نہیں سکے گا اسے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو یہی خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات، قرآن کی رہنمائی اور یہ کہ مادیت اور اخلاقیات اور مسائل و مقاصد کے درمیان رابطہ قائم کیا جائے، اگر مادیات ہیں، اور اخلاقیات نہیں تو تباہی کے سوا کچھ نہیں، یہ وہ پیغام ہے جو ہمارے اسلامی ملکوں کو دینا چاہیے تھا اور صاف کہنا چاہیے تھا کہ اے مغرب تو ڈوب رہا ہے، ہم تجھے بچا سکتے ہیں۔'' (۴۷۔۵۱)

اور پھر ایک تلخ حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''کاش ہمارا کوئی اسلامی ملک اس پوزیشن میں ہوتا کہ وہ مغرب کو پیغام دیتا اور مغرب سے آنکھیں ملا کر کہتا، اے مغرب! تو نے یہ ٹھوکر کھائی، اے مغرب! تیرے درد کی دوا ہمارے پاس ہے، تیرے درد کی دوا ہمارے قرآن میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام میں ہے، لیکن میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ ہماری گردنیں ندامت اور شرم سے جھک جاتی ہیں کہ کوئی اسلامی ملک بھی اس پوزیشن میں نہیں کہ اس ملک سے آنکھیں ملا کر خود اعتمادی سے کچھ کہہ سکے، یہ واقعہ ہے کہ ہم نے اپنے کو اس پوزیشن میں رکھا ہی نہیں ہے کہ ہم مغرب سے مردوں کی طرح بات کر سکیں، ہم جب مغرب سے بات کرتے ہیں تو سر سے لے کر پیر تک ہم اس کے احسانات میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں ہماری جہالت ہمارے خلاف گواہی دیتی ہے، ہمارا افلاس ہمارے سر پر چڑھ کر بولتا ہے، بھیک کے لیے ہمارا ہاتھ پھیلا ہوتا ہے، ایسی حالت میں کوئی اسلامی ملک اس مغرب سے جو کہ اقتدار کا مالک ہے، جس کو ہر طرح کی سیادت، علمی سیادت، سیاسی سیادت، اقتصادی سیادت حاصل ہے کیا بات کر سکتا ہے؟ کون سا ایسا ملک ہے، جو اس مغرب پر ادنیٰ تنقید کر سکے، اس مغرب کو کوئی لقمہ دے سکے، کوئی مشورہ دے سکے؟'' (۴۸۔۴۹)

اس کے علاوہ مولانا امریکا اور مغرب میں آباد مسلمانوں کو بیدار اور خبردار کرتے ہوتے کہتے ہیں:

''اگر آپ کی زندگی اور آپ کا یہاں قیام اسلام کے لیے مفید ہے، اور اس کی راہ ہموار کرتا ہے تو میں فتویٰ دیتا ہوں کہ آپ کا یہاں رہنا نہ صرف جائز بلکہ ایک عبادت ہے، اگر اپنے ایمان اور اپنے بچوں کی دینی زندگی کی طرف سے اطمینان نہیں تو مجھے اس سے بہت ڈر معلوم ہوتا ہے کہ نہ جانے یہاں کس حال میں موت آئے۔ ہم خدا کو کیا جواب دیں گے کہ صرف کھانے کمانے کے لیے وہاں گئے تھے، یہ نہ اسلامی کردار ہے، نہ مسلمان کی شان ہے، ہاں اگر آپ نے یہ انتظام کر لیا کہ آپ کے ایمان پر ذرہ برابر آنچ نہ آئے، آپ کسی دینی دعوت اور اسلام کی تبلیغ کرنے والی تنظیم میں شریک ہیں، آپ نے ماحول بنایا ہے، کوئی ایسا حلقہ بنایا جس میں دینی باتیں ہوتی ہیں، اور تذکیر ہوتی ہے، آخرت کی فکر ہوتی ہے، آپ یہاں غیر مسلموں کے سامنے ایسی زندگی پیش کر رہے ہیں، جس میں Charm ہے، کشش ہے، اور آپ نے اپنے بچوں کی دینی تعلیم

کا انتظام کرلیا ہے، یہ بہت اہم بات ہے، قیامت کے دن بچوں سے جب پوچھا جائے گا کہ تم کیسے اس حالت میں آئے ہو، نہ ہمارا نام جانتے ہو، نہ ہمارے رسول کا نام جانتے ہو، نہ نماز جانتے ہو، تو وہ کہیں گے کہ: کتاب ہمارے پروردگار ہم نے اپنے بڑوں کی بات مانی، انھوں نے جس راستہ پر لگایا ہم لگ گئے، انھوں نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔

آپ کے بچے بے شک اسکول جاتے ہوں گے، لیکن کیا آپ نے ان کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے، جس میں توحید و رسالت اور دین کی تعلیم حاصل کریں؟ جس کے بغیر آدمی مسلمان ہو ہی نہیں سکتا، اور آپ انھیں بتائیں کہ 'ولا تموتن الا انتم مسلمون'، خبردار اسلام کے علاوہ کسی اور راستے پر مرنا حرام ہے، کسی مسلمان بچے کی دینی تعلیم و تربیت کے بغیر زندگی سے اس کی موت بہتر ہے۔

میں صرف ان لوگوں کا یہاں رہنا جائز سمجھتا ہوں جنھوں نے اپنے ایمان کی حفاظت کا انتظام کرلیا ہے، اور غیر مسلموں میں دینی دعوت کو اپنا مقصد بنالیا ہے، ورنہ یہاں تو اس کا بھی اطمینان نہیں کہ ایک مسلمان کی، مرنے پر اسلامی طریقہ پر تجہیز و تکفین و تدفین بھی ہوگی! یہاں بوسٹن میں مقیم ہمارے ایک عزیز مولوی مدثر نے بتایا کہ یہاں ایک حاجی صاحب کا انتقال ہو گیا تو انھیں فون آیا کہ آخری رسوم میں شریک ہوں، وہاں پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ لاش تابوت میں رکھی ہوئی ہے، سوٹ پہنا رکھا ہے، ٹائی لگی ہے، سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے ہیں، عیسائی مرد عورتیں آرہے ہیں اور Kiss کررہے ہیں، تابوت پر پھول ہار وغیرہ ڈال رکھے ہیں، اللہ تعالیٰ اس نوجوان کی عمر میں برکت دے، آخر عربی مدرسوں میں پڑھنے سے فائدہ ہی ہوتا ہے، اس نے ان مرحوم کے لڑکے کو بلایا اور کہا کہ میں جاتا ہوں، انھوں نے پوچھا کیوں؟ انھوں نے کہا کہ میں جو کچھ کہوں گا آپ کریں گے نہیں۔ ان صاحب نے کہا کہ ہم نے آپ کو بلایا ہے، ہم آپ کی بات مانیں گے، مدثر نے کہا: پہلے تو ان کا سوٹ اتاریئے، لوگوں کو یہاں سے علیحدہ کیجیے۔ ہم ان کو شرعی طریقہ سے غسل دیں گے، کفن پہنائیں گے، یہ انگوٹھی بھی نکال دیجیے، ان صاحب نے کہا انگوٹھی نہ اتاریئے گا، ورنہ ہماری والدہ کا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ہم انگوٹھی ضرور علیحدہ کریں گے اگر آپ کی والدہ کے ہارٹ فیل ہونے کا خطرہ ہو تو انھیں ابھی نہ بتایئے بعد میں بتا دیجیے گا، خیر وہ راضی ہوئے۔

وہ تو اتفاق تھا کہ ہمارے یہاں کا وہ پڑھا ہوا بچہ وہاں پہنچ گیا ورنہ خدا جانے کتنے مسلمان اس ملک میں ایسے دفن ہو جاتے ہوں گے۔

ایک اور واقعہ سنا جس سے بڑی عبرت ہوئی کہ ایک مصری عالم کا انتقال ہوا، جنھوں نے اسلام پر انگریزی میں ایک اچھی کتاب لکھی ہے، ان کی بیگم امریکن تھیں، مسلمانوں کا قبرستان ذرا دور تھا، عیسائیوں کے قبرستان میں انھیں دفن کر دیا گیا، یہ چیزیں وہ ہیں، جنھیں ایک مسلمان خواب میں دیکھ لے تو چیخ اٹھے کہ یا اللہ خیر فرما، تو ہی حفاظت فرما، چہ جائیکہ یہ واقعات عام ہو جائیں اور ہم سن کر کوئی فکر نہ کریں۔

بھائیو! اپنی فکر کرو، اپنے اولاد کے اسلام پر قائم رہنے کا بندوبست کرو، ورنہ آپ لوگوں کا یہاں رہنا ہماری سمجھ میں نہیں آتا، ایک تو آپ خطرے میں ہیں، دوسرے آپ کا ملک خطرے میں ہے، ہندوستان و پاکستان کے جو تعلیم یافتہ نوجوان

یہاں آرہے ہیں، اگر وہاں رہتے تو جو دس بیس آدمی ان کے ماتحت کام کرتے، ان کو تقویت ہوتی، ان کے والدین اور ہم قوم افراد کو تقویت ہوتی، عرب ممالک کے نوجوان کثرت سے یہاں ہیں، اگر یہ اپنے وطن میں ہوتے تو اسے منظم بناتے، طاقت ور بناتے اور اپنی صلاحیتوں سے فائدہ پہنچاتے، محض تنخواہ کی زیادتی، اچھے مکان اور بہتر خور و نوش کے لیے یہاں آنا سمجھ میں نہیں آتا، یہ بات بہت سوچنے کی ہے، آپ کو مجھ سے یہ توقع ہوگی کہ میں آپ کے لیے دل خوش کن باتیں کرتا، میں نے وہ باتیں کہیں جس سے آپ کے دل کو چوٹ لگے، اور آپ اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کریں۔'' (۹۷۔۱۰۰)

''آپ اس بات کی بھرپور کوشش کریں گے کہ آپ کے پاس اسلام کا جو سرمایہ ہے، وہ کھونے نہ پائے، اگر آپ کو ذرا سا تصور آجائے کہ دنیا کی زندگی کتنی مختصر ہے اور آنے والی زندگی کتنی طویل ہوگی اور آخرت میں کن مراحل سے گزرنا پڑے گا تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ کا شدت پریشانی میں دم نکل جائے، اگر ہم نے اس ملک میں سب کچھ کیا لیکن آخرت کے استحضار اور خدا کے خوف کی یہ کمائی لٹادی تو ہم سے بڑھ کر کوئی بدنصیب نہ ہوگا، میں ایک حقیقت پسندانہ انسان کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ خدا کی قسم دانے دانے کا محتاج ہونا اس سے کہیں بہتر تھا کہ ہم اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈالیں، اور اپنی اولاد کے دینی مستقبل کو داؤں پر لگائیں، سب کچھ ملا اور ہم اپنے ایمان کی دولت کو کھو بیٹھے تو یہ سب سے بڑا خسارہ ہے۔

اپنے دل کا، اعمال کا، نفس کا محاسبہ کرتے رہیں، خود اپنے ممتحن بن جائیں، اور اس کو ٹٹولتے رہیں، اس کے لیے میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ سال دو سال کے بعد اپنے اپنے ملک کچھ عرصے کے لیے ضرور جایا کریں، وہاں سے رابطہ قائم رکھیں، ہندوستان، پاکستان اور حرمین شریفین ہو تو اور زیادہ بہتر ہے، اور وہاں رہ کر اچھے حقانی، ربانی لوگوں کے خدمت میں حاضر ہوں، جو بے غرض ہیں، جن کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہو، ان سے ملاقات کریں، یا کسی دینی ماحول میں تھوڑا وقت گزاریں، اگر یہیں رہیں گے تو تعلق باللہ اور ایمانی کیفیات کا سرمایہ خرچ ہوتا جائے گا۔ جیسے کہ بیٹری برابر استعمال میں رہے تو اس کا مسالہ ختم ہو جائے گا اس کو نئے سیلس (Cells) کی ضرورت ہوگی، اس طرح سے اپنے دلوں کی بیٹری کو بھی ہمیشہ نئے سیل دیتے رہیں، اور تھوڑے تھوڑے وقفے دو برس کے بعد، چار برس کے بعد سہی مگر آپ وطن چلے جائیں، ہم نے دیکھا ہے کہ جو لوگ اپنے ملک سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں کچھ اور بات ہوتی ہے، اور وہاں سے جو لوگ منقطع ہو گئے ان میں وہ بات نہیں رہی، انھیں معلوم نہیں کہ دین کا کیا معیار ہے، کیا کیفیات ہیں۔'' (۱۲۶۔۱۲۷۔۱۳۱)

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب کس قدر غیر معمولی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ بہر حال ایک انسانی کاوش ہے۔ اس میں بعض ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں مولانا کے ساتھ علمی پہلو سے اتفاق کرنا مشکل ہوتا ہے، لیکن ہم یہاں ان معاملات کو زیر بحث نہیں لائیں گے۔ اس لیے ایک تو ایسے مقامات بہت کم ہیں اور دوسرے ہمارے پیش نظر اس کتاب پر بحیثیت مجموعی تبصرہ کرنا نہیں ہے۔ ہمارا مقصد اس کتاب کے دعوتی اوصاف کو نمایاں کرنا ہے جو علماے دین کی کتابوں میں بہت کم ہوتے ہیں اور جن سے ہم مسلمان انفرادی اور اجتماعی، دونوں سطحوں پر محروم ہوتے جارہے ہیں۔ ضمنی اور

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اختلافی امور کو چھیڑ کر ہم اس دعوتی فضا کو خراب نہیں کرنا چاہتے جس میں اس کتاب کا قاری بہت جلد چلا جاتا ہے۔ وہ پستیوں سے اٹھ کر بلندیوں میں پرواز کرنے لگتا ہے اوران جہانوں کا بصیرت کی نگاہ سے مشاہدہ کرنے لگتا ہے جن کے بارے میں شاعر مشرق نے کہا ہے:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اور پھر ان جہانوں کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنے پر آمادہ اوران کے بلند مقامات کو پانے کے لیے بے تاب ہونے لگتا ہے۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

بیاض

—— جاوید

○

ظلمتِ شب سے گریزاں آفتاب   تیرگی عریاں ، افق غرقِ سحاب
رات کا صحرا ، حجازی قافلے   ٹوٹ کر بکھرے ہوئے صدیوں کے خواب
دیکھیے ہر سو بدن گرم ِ وجود   روح باقی ہے ، نہ اس کا اضطراب
حادثہ یہ ہے کہ دنیا میں کبھی   لوٹ کر آتا نہیں عہدِ شباب
دختِ افرنگی ، یہ غمزہ ، یہ ادا   کون لائے گا ترے جلووں کی تاب
دیکھتا کوئی یہ کاکل کے اسیر   بے صدا چہرے ، نگاہوں میں سراب
بات کچھ یہ بھی سمجھ لینے کی تھی   دعوتِ حق کی صدا یا انقلاب؟
یہ خطا کم ہے کہ اُن کے شہر میں   دیکھ سکتا ہوں صواب و ناصواب

وادیِ فاراں ، وہ دن بھی یاد ہیں؟
تیرے پتھر جب ہوئے تھے لعلِ ناب

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org